PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS
پاکستانی ادب کے معمار
تابش دہلوی: شخصیت اور فن
ڈاکٹر جابر حسین
اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی ادب کے معمار

تابشؔ دہلوی: شخصیت اور فن

ڈاکٹر جابر حسین

اکادمی ادبیات پاکستان

پطرس بخاری روڈ، سیکٹر H-8/1، اسلام آباد

نگران اعلیٰ	ڈاکٹر یوسف خشک
نگران منصوبہ طباعت :	اختر رضا سلیمی
مصنف	ڈاکٹر جابر حسین
تدوین	اختر عثمان
اشاعت	2020
تعداد	500
ناشر	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	نسٹ پریس، اسلام آباد
قیمت	مجلد:-/280 روپے
	غیر مجلد:-/240 روپے

ISBN: 978-969-472-455-3

Pakistani Adab Kay Maimar
Tabish Dehlvi: Shakhsiyat-aur-fun

Written By
Dr. Jabir Hussain

Publisher
Pakistan Academy of Letters
Islamabad, Pakistan

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

فہرست

پیش نامہ

پاکستانی ادب کے معمار سلسلے کی 143 ویں کتاب، تابش دہلوی شخصیت اور فن پیش خدمت ہے۔

اس سلسلے کی کتابوں کا بنیادی مقصد پاکستانی زبانوں کے اہم لکھنے والوں کی خدمات کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ ادب کے قارئین، محققین، ناقدین اور طالب علموں کو ان ادبی شخصیات کے متعلق بنیادی تحقیقی وتنقیدی مواد فراہم کرنا بھی ہے۔ یوں اس سلسلے کی کتابوں کی نوعیت جہاں تعارفی ہے وہیں تحقیقی وتنقیدی بھی ہے۔

تابش دہلوی ہماری ماضی قریب کے اردو ادب کا ایک اہم نام ہے۔ ان کا شمار بیسویں صدی کے ان شعرا میں ہوتا ہے، جنھوں نے اردو شاعری کی کلاسیکی روایت کو شاعری کی جدید روایت سے جوڑنے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ اپنے دور میں اردو مشاعروں کی جان سمجھے جاتے تھے اور ان کے بغیر کوئی بھی مشاعرہ نامکمل تصور ہوتا تھا۔ یوں انھوں نے اردو شاعری کو عام قارئین سے جوڑنے میں بھی بنیادی حصہ ڈالا۔

تابش دہلوی نے جہاں اردو کے دامن میں کئی اہم شعری مجموعے ڈالے، وہیں انھوں نے ''دید باز دید'' کے نام سے یادداشتیں لکھ کر بیسویں صدی کے ادبی دور کو ہمارے لیے محفوظ کر دیا۔

تابش دہلوی اس حوالے سے بہت خوش نصیب ٹھہرے کہ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں کر لیا گیا تھا اور انھیں حکومت پاکستان اور دیگر کئی ملکی و بین الاقوامی اداروں کی طرف سے بے شمار اعزازات سے نوازا گیا۔

اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر جابر حسین کا نام اگرچہ زیادہ معروف نہیں لیکن اس کتاب کو پڑھ کر قارئین کو اندازہ ہوگا کہ نہ صرف تابش دہلوی کی شاعری اور شخصیت پر ان کی گہری نظر ہے

بلکہ وہ بیسویں صدی کے مجموعی ادب پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔

انھوں نے یہ کتاب ایک ماہر محقق کی طرح انتہائی محنت سے لکھی ہے جس کے لیے ہم اُن کے شکرگزار ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ اس کتاب کے ذریعے ہماری ادبی تاریخ کے اہم شاعر کی شخصیت کے بہت سے ایسے گوشے نمایاں ہو کر سامنے آئیں گے، جو پہلے زیادہ نمایاں نہیں تھے۔

اس کتاب کی تزئین و آرائش اور طباعت کے لیے میں اپنے رفیق کار اختر رضا سلیمی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو اکادمی کے سہ ماہی جریدوں ''ادبیات'' اور ''ادبیات اطفال'' کے مدیر ہونے کے ساتھ ساتھ اس اشاعتی منصوبے کے نگران بھی ہیں۔

ہمیں قارئین کی تجاویز و آرا کا انتظار رہے گا۔

(ڈاکٹر یوسف خشک)

چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان

پیش لفظ

سید مسعود الحسن تابش دہلوی نے پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے ۲۳ برس قبل دلی اور حیدرآباد میں فانی بدایونی، جگر مرادآبادی، مرزا یاس یگانہ جیسے غزل کے نامور شعراء اور انھی کے فکری وفنی جوہر سے تخلیقی وارتقا پانے والی غزل کی قدیم تہذیبی روایت کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کیا۔ قیام پاکستان کے بعد دلی کی ٹکسالی زبان اور خاص لب ولہجے کے ساتھ غزل کی تہذیبی روایت کے اسرار و رموز کو اپنے شعور و لاشعور میں لیے پاکستان آئے اور تاحیات شعروادب کی اسی ادبی وتہذیبی روایت کی پاسداری و ترویج کرتے رہے۔

زبان وبیان اور فنی باریکیوں کے معاملے میں حد درجہ محتاط اور مثالیت پسند ہونے کے باعث اپنا پہلا مجموعۂ غزل ''نیمروز'' تاخیر سے ۱۹۶۲ء میں چھپوایا۔ یوں زمانی اعتبار سے تابش دہلوی ساٹھ کی دہائی کے غزل گویوں میں شمار ہوتے ہیں۔ میدانِ ادب میں ان کی خدمات اور حسنِ کارکردگی کا اعتراف کرتے ہوئے ۲۳ مارچ ۱۹۹۹ء کو صدر پاکستان نے انھیں ''تمغۂ حسن کارکردگی'' کا قومی اعزاز عطا کیا۔

تابش دہلوی کا بنیادی تخلیقی میدان غزل ہے لیکن انھوں نے نظم، نعت، مرثیہ، منقبت اور ہائیکو کو بھی اپنے تخلیقی سفر میں بحسن وخوبی شامل کیا۔ ان اصناف میں بھی انھوں نے اپنی فنی مہارت کی داد وتحسین وصول کی۔ غزل میں انھوں نے ''اُس زمانے میں نام پیدا کیا جب فانیؔ، فراقؔ، یگانؔہ، اصغرؔ، جگرؔ اور حسرتؔ کے سے اساتذۂ فن سے سارا برصغیر گونج رہا تھا'' (احمد ندیم قاسمی مجلۂ نذرِ تابش، ص۲۳۶)۔

ان کی تمام شاعری بالخصوص غزل اول وآخر جنس زدگی، سفلی جذبات اور بے تکا اظہار وصال وغیرہ جیسی فکری قباحتوں سے یکسر مبرا ہے۔ ان کی شاعری اس قاریٔ سخن کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں

لیتی ہے جو اردو غزل کی تہذیبی ولسانی وفنی روایت سے خوب آگاہ و آشنا ہو۔ بصورت دیگر عام قاری کو ان کی شاعری بالخصوص غزل قطعاً اپیل نہیں کرتی۔ زبان و بیان کی شستہ، پاکیزہ اور تہذیبی رچاؤ تابش دہلوی کی تمام شاعری میں نظر آتی ہے اور یہی امر ان کی تخلیقات کا نشانِ امتیاز بھی ہے۔ مضامین کی سنجیدگی، فنی پختگی و کمال، فکری نفاست و پاکیزگی، زبان کی مٹھاس اور اسلوب کا دھیما پن ایسی خصوصیات ہیں جو تابش دہلوی کی شاعری کو ایک بلند اور ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کے بقول "اس وقت تابش دہلوی واحد شاعر ہیں جن کی غزل میں دو زمانوں کا ایسا امتزاج اور قدیم و جدید کا ایسا ادغام موجود ہے جو فطری انداز میں عمل میں آیا ہے اور جس کی آبیاری لاشعور کے تخلیقی سرچشموں سے ہوئی ہے۔" (مجلہ نذرِ تابش، ص ۲۵۰)۔

ان کی طبیعت عام معمولاتِ زندگی میں جتنی نفاست پسند تھی اتنی ہی لسانی نفاست پسندی کا اہتمام ان کی پوری شاعری میں نظر آتا ہے۔ ان کی شخصیت اور تمام شاعری بالخصوص غزلیں زبان و بیان، تہذیب و شائستگی اور لب و لہجے اور تہذیبی رکھ رکھاؤ کے اعتبار اس دور میں شعر و ادب کی قدیم روایات و شخصیات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔

میں اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین محترم ڈاکٹر یوسف خشک صاحب کا ازحد شکرگزار ہوں کہ ان کی سرپرستی میں میں زیرِ نظر کتاب "تابش دہلوی: شخصیت اور فن" شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کی ترتیب و تزئین و طباعت میں ہمدردانہ رہنمائی، معاونت و اظہارِ شفقت پر میں محترم علی یاسر صاحب (مرحوم)، اختر رضا سلیمی صاحب اور ڈاکٹر راشد حمید صاحب کا تہِ دل سے شکرگزار ہوں۔ تابش دہلوی کے فرزندِ ارجمند مسعود تابش صاحب کا بہت شکریہ کہ انھوں نے بھرپور تعاون کرتے ہوئے حقِ فرزندی ادا کیا۔

ڈاکٹر جابر حسین

تابشؔ دہلوی: سوانح و شخصیت

خاندانی پس منظر

سید مسعود الحسن تابشؔ دہلوی مولوی ثناء اللہ کے بیٹے، مولوی عنایت اللہ کے پوتے، مولوی ذکاء اللہ کے نواسے تھے۔ تابشؔ کے پڑ دادا کا نام نظام الدین نظامی تھا جو شعروادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ معروف تذکرہ نگار نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ سے نظام الدین نظامی کے قریبی مراسم تھے۔ تابشؔ کے نانا مولوی عنایت اللہ اور پڑ نانا مولوی ذکاء اللہ دارالترجمہ حیدرآباد کی معروف شخصیات میں سے تھے۔

ان کے پڑ دادا نظام الدین نظامی ایک لائق اور شعروشاعری سے شغف رکھنے والی شخصیت تھے۔ انھوں نے فارسی شاعری کے علاوہ فارسی ہی میں نثر بھی لکھی ہے۔ ان کے مجموعے "عناقید نورس" اور "سرود مستانہ" ایک گراں قدر ادبی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صہبا لکھنوی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> تابشؔ صاحب کے پردادا نظام الدین صاحب نظامی فارسی کے مستند ادیب و شاعر تھے۔ ان کی دو قلمی تصانیف عناقید نورس اور سرود مستانہ اب بھی آپ کے پاس محفوظ ہیں۔(۱)

مختار زمن کے ایک مضمون "تابشؔ دہلوی ایک تاثر" کے مطابق نظام الدین نظامی کے معروف اردو شاعر و تذکرہ نگار "نواب مصطفیٰ خان شیفتہ سے قریبی مراسم تھے۔"(۲) صہبا لکھنوی نظامی کے دوستوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> نظامی صاحب غالبؔ کے ہم عصر شاعر شیفتہؔ کے عزیز دوستوں میں تھے۔ آپ کے دادا فیض الحسن صاحب بھی شعروادب سے دلچسپی رکھتے تھے اور محسن کاکوروی سے ان کے گہرے دوستانہ روابط تھے۔(۳)

تابشؔ دہلوی کے پڑ نانا شمس العلما مولوی ذکاء اللہ تھے اور نانا جناب مولوی عنایت اللہ تھے جو کہ

حیدرآباد دکن کے دارالترجمہ کے ناظم کے طور پر خدمات سرانجام دیتے تھے۔

آپ کے پرنانا شمس العلما مولوی ذکاء اللہ اور مولوی عنایت اللہ صاحب ناظم
دارالترجمہ حیدرآباد دکن کی شخصیتیں اردو ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔(۴)

مولوی عنایت اللہ ایک قابل اور نامور مترجم بھی تھے۔ترجمہ نگاری کی صلاحیت ان میں طالب علمی کے زمانے ہی سے نکھر کر سامنے آئی تھی بقول مختار زمن:

سرسید احمد خاں نے مولوی عنایت اللہ سے ''پریچنگ آف اسلام'' کا ترجمہ اس وقت
کرایا تھا جب مولوی صاحب علی گڑھ میں انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔(۵)

مولوی عنایت اللہ کے بیٹے مولوی ثناء اللہ پیشے کے لحاظ سے زمیندار تھے اور یہی ان کا ذریعہ آمدن تھا۔مولوی ثناءاللہ کے یہاں مسعود الحسن کی پیدائش ہوئی جو بعد میں تابش دہلوی کے نام سے معروف ہو گئے۔دینی جذبہ وعقیدہ تابش صاحب کے خاندان کے فرد فرد کے دل میں ابتدا ہی سے تھا۔چناں چہ ان کے پرنانا، پردادا سب دینی اقدار اور اقتابات کے حامل تھے۔تابش دہلوی کی طبیعت میں بھی دین، بزرگان دین اور رسومات دین سے محبت وعقیدت کا جذبہ اسی خاندانی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔یہی وجہ ہے کہ تابش صاحب دیندار آدمی تھے،نماز روزے کے پابند،بزرگان دین کے عقیدت مند تھے۔(۶) تابش کی دینی اقدار سے محبت خصوصاً نماز کی طرف رغبت کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے سید جاوید حسن نے لکھا ہے:

تابش صاحب محبت کی قضا روا سمجھتے ہیں نماز کی نہیں۔ادھر مؤذن حی علی الفلاح
تک پہنچا ادھر تابش صاحب کسی محفل، کسی مجلس میں بیٹھے ہوں جھٹ کھڑے ہو
جاتے۔ایک گوشہ تلاش کرتے اور پھر ''یہ'' ہیں اور ''وہ'' ہے۔(۷)

تابش دہلوی صاحب کے ددھیال اور ننھیال کا تعلق علمی وادبی سپوتوں سے تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ تابش بھی وادیٔ ادب میں بس کر اپنا منفرد اور بلند مقام بنا گئے۔ان کے سسرال (دوسری بیوی کا خاندان) کا تعلق بھی ادب سے تھا۔ان کی دوسری بیوی نواب طالع یار خان کی پوتی تھی۔ڈاکٹر محمود الرحمٰن کے مطابق ''یہ وہی طالع یار خان ہیں جن کا ذکر مرزا غالب نے اپنے خطوط میں کیا ہے''(۸)

ڈاکٹر محمود الرحمٰن مزید لکھتے ہیں کہ تابش کی یہ بیوی رشتے کے لحاظ سے غالب کی بھانجی لگتی ہے۔یوں تابش کے ددھیال،ننھیال اور سسرال تینوں کا تعلق اردو ادب کی قد آور شخصیات سے جڑتا

ہے۔اور تابش کی سخنوری میں ان تینوں کے خون جگر، فکر رسا اور انداز بیاں کی آمیزش ہوئی۔ افضل صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

> گھرانا بھی نامور جید عالموں اور فاضلوں کا تھا۔ ددھیال مولوی نظام الدین نظامی کی تھی جو فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے اور ننھیال شمس العلما مولوی ذکاء اللہ کی تھی جو تابش صاحب کے پرنانا تھے۔(۹)

پیدائش اور ابتدائی تعلیم

۹ نومبر ۱۹۱۱ء کو دہلی کی مردم خیز زمین میں مسعود الحسن نے مولوی شاہ الحسن کے گھر میں آنکھ کھولی۔ قرآن مجید اور عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم دہلی ہی میں حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے لیے تابش دہلوی نے دلی کے ایک ہندو صوفی منش بزرگ منشی شودیاں کایستھ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے۔ منشی شودیاں صاحب وحدت ادیان کے قائل ایک باکردار، شریف اور خوش خلق شخصیت تھے۔ مختار زمن نے منشی شودیاں کے بارے میں لکھا ہے:

> وہ وحدت ادیان کے قائل تھے۔ نماز بھی پڑھتے تھے اور پوجا بھی کرتے تھے۔ سنسکرت بھی جانتے تھے اور عربی فارسی کے بھی عالم تھے۔ ان کی آزاد خیالی کے باعث گھر والوں نے انھیں گھر سے نکال دیا۔ شودیاں صاحب نے ایک مکتب کھولا۔ اسی مکتب میں تابش صاحب نے ان سے قرآن پڑھا۔ شودیاں نہایت نفیس طبع، خوش گفتار اور خوش خط انسان تھے اب یہی وضع شاگرد کی ہے۔(۱۰)

تابش کے پردۂ ذہن میں ان کے بتائے اور سکھائے ہوئے عربی و فارسی زبان کے اصول و ضوابط اور اخلاقی نکات اچھی طرح نقش ہو گئے اور فارسی شعر و ادب سے رغبت پیدا ہوئی۔ بعد میں یہی رغبت تابش کو میدان سخن میں اپنا رہوار سخن دوڑانے کی تحریک ثابت ہوئی۔ بعض گھریلو مسائل کی وجہ سے "۱۲۔۱۳ سال کی عمر میں تابش کو مولوی عنایت اللہ کے پاس حیدرآباد روانہ کر دیا گیا۔"(۱۱)

دہلی سے دور حیدرآباد کے ایک مشہور سکول "دارالعلوم" میں تابش دہلوی کو آٹھویں جماعت میں داخلہ ملا۔ تابش دہلوی نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل کتاب "دید باز دید" میں شامل تحریروں "جب میں

حیدر آباد میں تھا" اور " مبتدا" میں اس دار العلوم کی قدامت اور ان پر اس مادر علمی کے اثرات کے بارے میں لکھا ہے:

> دار العلوم ہندوستان کے قدیم ترین سکولوں میں سے تھا،اس کی قدامت کا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ مہاراجہ کشن پرشاد نے بھی اسی سکول میں تعلیم پائی تھی۔(۱۲)
>
> وہاں کی تہذیبی اور تمدنی زندگی کی اعلیٰ قدروں سے بھرپور استفادہ کیا اور یہی وجہ ہے کہ لڑکپن کے یہ تہذیبی نقوش میرے ذہن و دل پر آج بھی مرتسم ہیں۔(۱۳)

نویں اور دسویں جماعت کی تعلیم دہلی کے ایک ہندو ہائی سکول سے حاصل کی۔میٹرک کے بعد گھریلو حالات کی ناسازگاری کے باعث ان کا تعلیمی سلسلہ قدرے جمود کا شکار ہوا۔تابش کے دل میں حصول تعلیم کا شوق ابتدا ہی سے تھا۔چناں چہ اپنے تعلیمی سفر کے رکنے سے انھیں ایک طرح کی بے چینی اور اضطرابی کیفیت محسوس ہونے لگی۔لہٰذا تعلیمی سلسلے کو دوبارہ شروع کیا اور کراچی یونیورسٹی میں بی۔اے کے لیے داخلہ لیا اور اس مرحلے کو بھی کامیابی سے طے کیا۔

تابش صاحب چوں کہ بقول ڈاکٹر محمد اسلم فرخی "محنت سے ترقی کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔"(۱۴)لہٰذا محنت و لگن کے بل بوتے پر انھوں نے بی۔اے کے بعد ایم۔اے میں بھی داخلہ تو لیا لیکن خانگی اور معاشی مجبوریوں نے زنجیر پا بن کر انھیں اس سلسلے کو آگے بڑھانے سے روکا۔

ذوقِ تعلیم اور شوقِ مطالعہ چوں کہ تابش کے دل میں موجود تھا۔لہٰذا انھوں نے تعلیمی سلسلہ منقطع ہونے نہیں دیا اور اپنے مطالعہ کے دائرے کو وسعت دیتے رہے۔مسلسل ادبی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے باعث ان کی ادبی معلومات میں اتنی گہرائی اور گیرائی آئی کہ وہ برجستہ کسی بھی ادبی موضوع پر سیر حاصل بحث کر سکتے تھے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر محمود الرحمٰن لکھتے ہیں:

> انھوں نے ذاتی محنت اور مسلسل ریاض سے اپنے وقار کو بلند کرنے کی کوشش ہمیشہ کی ہے۔۔۔۔مسلسل مطالعہ اور غور و فکر سے اپنی معلومات کو خاصا وسیع کر لیا۔یہی وجہ ہے کہ وہ ادب کے کسی بھی موضوع پر بے تکان بول سکتے ہیں۔(۱۵)

ازدواجی زندگی

ذوقِ شعر اور شرافت دونوں خوبیاں تابش دہلوی کو خاندانی وراثت میں ملی تھیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ اللہ نے انھیں نیک اور باکردار شریکِ حیات عطا کر دی تھی۔ تابش صاحب نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی ۲۸ سال کی عمر میں ۱۹۳۹ء میں عرب سرائے (دہلی) کے ایک سید گھرانے میں انجام پائی۔ پہلی شادی سے ان کے آنگن میں ایک بچی کی شکل میں خوشیوں اور رحمتوں کا ورود ہوا۔ پانچ سال بعد پہلی بیوی کا انتقال ہوا۔ پہلی بیوی کے بطن سے پیدا ہونے والی بچی اب اس وقت صاحب اولاد ہیں۔ دوسری شادی ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ انکی دوسری بیگم نواب طالع یار خان کی پوتی اور نواب افضل یار خان کی صاحب زادی تھیں۔ افضل یار خان کے خسر حکیم احسن اللہ خان تھے اور نواب مصطفیٰ خان شیفتہ ان کے ماموں تھے۔ دوسری شادی سے ان کے ہاں تین بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوا۔ ان کی ایک بیٹی کا نام شیفتہ ہے جو ایم۔اے پاس ہیں۔ ابھی ایک بینک میں بطور آفیسر اپنے فرائض سر انجام دے رہی ہیں۔ بیٹا مسعود تابش کراچی میں مقیم ہے اور صاحب روزگار و خوشحال ہے۔ مسعود تابش بھی اپنے والد کی طرح خوش پوش، خوش مزاج، مہذب اور شائستہ اسلوبِ حیات کے حامل و مالک ہیں۔ وہ اولاد کے سلسلے میں ایک شفیق و مہربان باپ اور شریکِ حیات کے سلسلے میں ایک مخلص، ہمدرد اور ذمہ دار شوہر تھے۔ شریکِ حیات اور اولاد سے اظہارِ محبت و شفقت و ہمدردی کو اپنا دینی و اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔ والدین کی خدمت کا جذبہ بقول ڈاکٹر اسلم فرخی: ''تابش صاحب کے ہاں یہ جذبہ دوسروں سے زیادہ ہے۔''(۱۶)

بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں تابش دہلوی کا رویہ وقدیم ترجیحی رویوں کا مرقع معلوم ہوتا ہے۔ وہ قدیم عہد کے والدین کی طرح اولاد کی تعلیم اور خور و نوش میں بخل انگاری و قناعت پسندانہ رویہ اپناتے تھے نہ جدید زمانے کے والدین کی طرح اولاد کو عیش و عیاشی، آوارہ خرامی اور مادر پدر آزاد ماحول مواقع فراہم کرنے کے حامی تھے بلکہ وہ ہر لحاظ سے نفاست پسندی، تہذیب و شائستگی اور میانہ روی کو تربیتِ اولاد کے سلسلے میں مقدم سمجھتے تھے۔ گویا کہا جا سکتا ہے کہ اولاد کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں تابش دہلوی کا نقطۂ نظر یوں تھا۔ ''کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ سے۔'' تابش دہلوی کی ذاتی زندگی سے جس طرح رکھ رکھاؤ، صفائی اور نفاست جھلکتی تھی ان کے خاندان میں بھی کم و بیش یہی خصوصیات بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔

تابش کا حلیہ

ڈاکٹر اسلم فرخی نے تابش دہلوی کا حلیہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

لمبا قد، بڑی بڑی روشن آنکھیں، ستواں ناک، چوڑی پیشانی، مسکراتا کتابی چہرہ، ڈھال میں وقار، جامہ زیب لباس سے غیر معمولی نفاست، کپڑے عارف کامل کے دل کی طرح بے داغ، کوئی سلوٹ نہ شکن، صادق الخیری مرحوم کہا کرتے تھے: تابش کیا تم کپڑے پہننے کے بعد استری کرواتے ہو؟ (۱۷)

شاعری کا آغاز و انداز

اگر ننھیال اور ددھیال کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے تو تابش دہلوی میں علم و ادب اور شعر و سخن سے رغبت و شغف کا پیدا ہونا فطری امر معلوم ہوتا ہے۔ شعر و شاعری کا یہ ذوق انھیں وراثت میں ملا تھا۔ چناں چہ اس ذوق نے صغر سنی ہی میں تابش دہلوی کے نہاں خانۂ دل سے نکل کر پیرائیہ اظہار پایا۔ اپنے ایک مضمون "جب میں حیدرآباد میں تھا" میں اپنی شاعری کی خشتِ اول کے حوالے سے لکھا ہے:

تیرہ سال کی عمر بڑی عجیب ہوتی ہے۔ ایک طرف لڑکپن کی آخری منزلیں ہوتی ہیں اور دوسری طرف جوانی کے ابتدائی مراحل۔ لڑکپن اور جوانی کا یہ ملا جلا دور آدمی کو عجیب عجیب سنہرے خواب دکھاتا ہے۔ اس کے احساسات ناپختگی میں پختہ اور اس کی عقل پختگی میں ناپختہ ہوتی ہے۔ فطرت نے مجھے ایک حساس دل بخشا تھا جو آگے چل کر میری شاعری کی خشتِ اول ثابت ہوا مگر یہ خشتِ اول کج نہاد نہیں رہی بلکہ وہاں کے ادبی اور شعری ماحول نے اسے میری تعمیری بنیاد میں اس طرح رکھا کہ میری روح کی ساری عمارت آج تک اسی پر کھڑی ہے اور پینسٹھ سال سے بہت سے زلزلوں اور موسموں کی تخریبی قوتوں کا اس پر اثر نہیں۔ (۱۸)

اولین شعر تابش دہلوی نے تب کہا جب وہ ابھی میٹرک بھی پاس نہیں کر چکے تھے۔ ابتدا میں ان کا تخلص مسعود ہی تھا چناں چہ ڈاکٹر انور سدید اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

تابش (پ ۱۹۱۱ء) نے غزل کا پہلا شعر ۱۹۲۳ء میں کہا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۲ برس تھی۔ اور وہ مسعود کے نام سے موسوم ہوتے تھے۔ (۱۹)

ان کی شاعری کے آغاز پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید مزید لکھتے ہیں کہ جب تابش دہلوی نے مشاعرے کی طرح سنی تو ان پر ایک مقطع یوں اترا:

کہاں کہاں مجھے مسعود لوگ ڈھونڈ آئے
بھلا میں اس کی گلی کے سوا کہاں جاتا

مختار زمن نے ان کی پہلی مطبوعہ نظم "دِلّی" کا حوالہ دیا ہے جو ۱۹۳۰ء میں معروف ادبی ماہنامے "ساقی" میں چھپی۔(۲۰) اس ماہنامے کے ایڈیٹر معروف ادیب شاہد احمد دہلوی تھے۔ مختار زمن کی اس بات کے مطابق تابش دہلوی کی پہلی نظم جس وقت چھپی اس وقت ان کی عمر لگ بھگ ۱۹ سال قرار پاتی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اور مختار زمن کے حوالوں کے مطابق تابش دہلوی نے ۱۹ سال کی عمر میں نظم کہی اور چھپ بھی گئی جبکہ لگ بھگ ۲۲ سال کی عمر میں پہلی غزل کہی۔ تابش دہلوی کی پہلی مطبوعہ نظم پڑھ کر میر ناصر علی مرحوم نے ماہنامہ "ساقی" کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی سے کہا کہ انشاءاللہ یہ بچہ بھی بڑا شاعر بنے گا۔(۲۱)

جذبہ حسن و جمال ایک انسانی فطری تقاضا ہے۔ اس کا اظہار ہر ذی شعور اپنی عمر کے کسی نہ کسی مقام پر کر ہی لیتا ہے اور شباب کا زمانہ اس جذبے کے اظہار کا مناسب ترین زمانہ ہوتا ہے۔ بعض لوگ اس فطری جذبے کو بے محل اور شدید قسم کی پابندیاں عائد کر کے پسپا کرنے کے حق میں ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ فطرت دبائے سے دبتی نہیں اور چھپائے سے چھپتی نہیں بلکہ جوں ہی پابندیاں اور قیود ہٹ جاتی ہیں تو فطرت پوری شدت کے ساتھ ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حسن و جمال کے فطری جذبے کو تمام قیود اور پابندیوں سے آزادی دلانی چاہیے۔ بالفاظ دیگر وہ جذبہ حسن و جمال کو شتر بے مہار کی مانند آزادانہ طور پر پروان چڑھانے کے حامی ہیں۔ لیکن اصولی طور پر دیکھا جائے تو یہ دونوں رویے انتہا پسندی کی غمازی کرتے ہیں۔ اس فطری جذبے سے مناسب اور بہتر استفادہ کرنے کے لیے نیز فرد کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا کرنے کے لیے احساسِ جمال کی مناسب اور معتدل نوعیت کی تربیت اور حوصلہ افزائی و رہنمائی کرنا زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ وہ شاعر اور ادیب اچھا اور بڑا بن سکتا ہے جو قوتِ مشاہدہ، حسنِ ادراک اور جذبۂ حسن و جمال کی مطلوبہ کیفیت و کمیت کا حامل ہو۔ حسِ جمالیات کی بیداری شعر و سخن کی طرف رغبت دلانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر شعرا اپنی شاعری کا آغاز جمالیاتی مظاہر سے لو لگا کر کرتے ہیں۔

تابش دہلوی کی شاعری کا آغاز بھی جذبۂ حسن و جمال کے تحت ہوا۔ اس وقت وہ آٹھویں

جماعت کے طالب علم تھے۔ اس سلسلے میں ایک اہل قلم نے لکھا ہے:

پہلے پہلے جب وہ آٹھویں میں زیر تعلیم تھے تو یہ شعلہ بھڑکا تھا جس نے انھیں پوری طرح گرفت میں لے لیا تھا۔۔۔۔ اس اولین عشق کا اثر آج تک ان کی رگ و پے میں جاری ہے۔ (۲۲)

احساس جمال اور جذبہ عشق کو رہنما بناتے ہوئے تابش نے اپنی شاعری کی عمارت استوار کی۔ چناں چہ ڈاکٹر محمود الرحمٰن ان کی شاعری کے آغاز اور احساس حسن وعشق کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:

بچپن کے ایک چھوٹے سے رومانس نے انھیں ابتدائی زندگی ہی میں بے حد مغموم اور افسردہ بنا ڈالا اور محبت کی اس دردانگیزی نے اوائل عمری ہی میں ان پر گہرا اثر قائم کیا۔ اس رومانس نے طالب علمی کے زمانے میں جب کہ ان کی عمر مشکل سے بارہ تیرہ سال کی تھی شعر کہنے کی تحریک پیدا کی۔ محبت کی یہی صداقتیں ہر منزل میں ان کی راہنما بنیں۔ (۲۳)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جذبہ حسن اور احساسِ غم تابش کے کلام کا محرک بنا۔ ان کے ابتدائی دور کا کلام بھی اس بات کی شہادت دیتا ہے۔ چناں چہ دو شعر بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں۔

دنیائے خرابی میں تنہا ہے ترا تابش
کثرت ہے غم دل کی اے جلوۂ یکتائی

☆☆

تم کس کی محبت میں گرفتار ہو تابش
یہ شہر نگاراں ہے کوئی نام تو لیتا

رفتہ رفتہ کلام تابش نے بڑی بڑی ادبی محفلوں میں موقع اظہار پایا۔ چناں چہ وہ ادبی محفلوں اور مشاعروں میں شرکت کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اپنا کلام بھی سنا دیتے تھے۔ ان کے کلام میں حسن اور پختگی کے عناصر کی موجودگی کے باعث ان کی نوجوانی ہی میں مختلف ادبی رسائل وجرائد میں کلام تابش چھپنے لگا۔

ویسے جوانی میں وہ مشاعروں میں بھی پڑھنے لگے تھے اور اعلیٰ معیاری ادبی محفلوں میں بھی ان کا کلام شائع ہونے لگا تھا۔ (۲۴)

یوں دنیائے شعر وسخن میں تابش نے باقاعدہ طور پر قدم رکھا۔ وہ شعر تخلیق کرتے رہے، ادبی رسالوں میں ان کی تخلیقات چھپتی رہیں۔ سب سے پہلی نظم ''دلی'' دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''ساقی'' میں چھپی۔ رسائل وجرائد میں تابش کا کلام چھپنے کے علاوہ نشرگاہوں سے ان کا کلام نشر بھی ہونے لگا۔ ۱۹۳۲ء کے بعد سرگودھا میں جب ریڈیو سٹیشن کا محکمہ قائم ہوا اور نشریات نشر کی جانے لگیں تو یہاں تابش اپنا کلام بھی سناتے تھے چناں چہ اس ضمن میں وہ خود لکھتے ہیں:

> سرگودھا میں کا یک خوب صورت ریڈیو سٹیشن تعمیر ہوا تھا اس نشرگاہ سے مجھے بھی اپنا کلام نشر کرنے کا شرف حاصل رہا۔ (۲۵)

کسی تخلیقی فن پارے میں اسلوب تخلیق کار کی شخصیت کا عکاس ہوتا ہے۔ قلم کار جب عمل تخلیق کی طرف مائل ہوتا ہے تو وہ اپنے جذبات، احساسات، خیالات اور نظریات کو ایک موزوں اور دلنشیں پیرائیہ اظہار عطا کرنا چاہتا ہے اور یہی انداز اظہار اور پیرایہ بیاں اس کی تخلیق اور شخصیت کی شناخت اور پہچان بن جاتا ہے۔

تابش دہلوی اپنے اسلوب و انداز بیان کے حوالے سے اپنے عہد کی تہذیب کے عکاس نظر آتے ہیں۔ ان کی تہذیب، ان کی شرافت وصداقت کی آئینہ دار ہے۔

یہ معابد یہ محلات کے زریں در و بام
مجھ کو اجداد سے ورثے میں ملے ہیں لیکن

☆☆

میرے پندار شرافت کو ہو کس طرح قبول
میرا ورثہ میری تہذیب ہے پتھر تو نہیں

تحریر وتقریر، زبان و بیان اور قول وفعل میں اپنی تہذیب وثقافت وروایات کا خیال رکھنا تابش کا نمایاں وصف ہے۔ تخلیق شعر کے وقت وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ کہیں کوئی مصرع یا شعر یا بات ان کی شاندار تہذیب وروایات کے منافی ضبط تحریر میں نہ آجائے۔ ان کا اسلوب نگارش انسان دوستی، شائستگی، متانت اور شرافت کا امین ہے۔ ڈاکٹر وقار احمد رضوی ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں:

> تابش دہلوی ایک شاعر ہی نہیں بلکہ تہذیبی انسان ہیں۔۔۔ تہذیب وشائستگی ان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ (۲۶)

تابش دہلوی کا انداز تحریر ایک طرف سے قاری کو متانت و شائستگی کی طرف دعوت دیتا ہے اور دوسری طرف تہذیب و تمکنت و متانت کو لاشعوری طور پر قاری کے ذہن میں بٹھانے کی سعی کرتا ہے۔ یوں ان کا کوئی شعر تہذیب و آداب سے گرا ہوتا ہے نہ متانت کے دائرے سے خارج۔ چناں چہ ڈاکٹر وقار احمد رضوی کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ "ان کا کوئی شعر تہذیب سے گرا ہوا نہیں ہوتا۔ وہ تہذیب و ثقافت کے دائرے میں رہتے ہوئے شاعری کرتے ہیں۔" (۲۷)

اسلوب کا انحصار بہت حد تک الفاظ و تراکیب کے انتخاب و استعمال پر بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صاحب اسلوب تخلیق کار اور فن کار کا اسلوب دوسروں سے اکثر اوقات الفاظ کی ندرت، تراکیب کی جدت اور ان کے دقیق استعمال کی بنا پر ممتاز ہوتا ہے۔ فنکار اپنی تخلیقات میں ایسے الفاظ اور ترکیبوں کو برتتا ہے جو اس کے ذوق کی درست ترجمانی اور خیالات کی صحیح ترسیل کر سکیں۔ اس تناظر میں تابش کے اسلوب کا جائزہ لے لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ قاری، معنی اور الفاظ تینوں کو بیک وقت افہام کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے کلام تخلیق کرتے ہیں۔ وہ لفظوں، تراکیب و محاورات کا فنکارانہ اور خلاقانہ استعمال جانتے ہیں۔ وہ اپنے ایوان سخن میں ابتذال، پھکڑ پن اور سوقیت کو راہ بھی نہیں دیتے۔ سطحیت و پژمردگی کے عناصر کے لیے دلچسپ اور اشاریت آمیز اسلوب کے باعث ان کے کلام میں کوئی جگہ نہیں ملتی۔

پھر بھی نہیں ہے قیمت . دیدار دوست
گو ہر نگاہ جلوہ گہہ کائنات ہے

☆☆

سیل گریہ کر گیا شاداب گلزار امید
دل سے جو نالہ اٹھا سرو چراغاں ہو گیا

ڈاکٹر شاہدہ حسن نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

> تابش دہلوی کو ورق ورق پڑھتے چلے جایئے نہ کسی حرف میں ابتذال ملے گا نہ کسی خیال میں سطحیت، نہ کیفیتوں میں خودرحمی نہ احساس میں پژمردگی۔ (۲۸)

اسلوب کی جاذبیت اور لفظوں کا ماہرانہ استعمال تابش کی نظم اور نثروں میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ شاعری میں ان کا اسلوب ہی ان کی پہچان کرواتا ہے۔ ان کے اسلوب شعر میں ایک نیا پن نظر آتا ہے جو اول و آخر برقرار رہتا ہے۔

کسی نوعیت کی تکرار نہیں ملتی۔ بس اسلوب اظہار نیا اور یکساں ملتا ہے جس سے
تابش صاحب کی شناخت ہوتی ہے اور اس اسلوب میں بھی عجب طرفگی
ہے۔(۲۹)

غزل میں ان کا اسلوب ایمائیت، اشاریت کا علم بردار ہے۔ وہ جذبۂ عشق کو حصول حقیقت کا
ذریعہ بناتے ہیں اور اظہار محبت میں ضبط آداب کی پابندی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اپنے اسی اسلوب شعر
کے سلسلے میں ان کے چند شعر یوں ملتے ہیں:

رہا اک اک قدم پر پاس، و آداب طلب ورنہ
وہاں ہم تھے جہاں پانا ترا مشکل نہیں ہوتا

☆☆

تمھیں کس نام سے آخر پکاریں
بصیرت کی ہیں تم پر بند راہیں

☆☆

تمھاری حسن صورت پر نظر ہے
تمھیں کب حسن معنی کی خبر ہے

☆☆

لازم ہے پاسداریٔ آداب ۔ ضبط غم
نالہ بھی احتیاط سے کرنے کی بات ہے

ڈاکٹر غلام شبیر رانا اسلوب کے سلسلے میں ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں:

اچھا ادیب الفاظ پر خلاقانہ دسترس کی بدولت لفظ اور خیال میں ایسا ربط پیدا کر دیتا
ہے کہ تخلیق کار کے دل سے نکلنے والی بات الفاظ کی صورت میں قاری کے دل میں
اترتی چلی جاتی ہے۔۔۔اور اسلوب میں ایسی روح پیدا ہو جاتی ہے جو دلوں کی
دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو کر قاری وجدانی کیفیت سے آشنا کرتی ہے۔(۳۰)

اس اقتباس کی روشنی میں تابش صاحب کے اسلوب کا جائزہ لیں تو یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی
ہے کہ قاری کلام پڑھتے ہوئے ایک لمحے کے لیے اپنے آپ سے بیگانہ ہو کر تابش کے ساتھ سفر کرنے لگتا

ہے۔ یہاں ان کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

ہمارے دیدۂ تر میں اثر ہے ابر نیساں کا
صدف چشمی سے آنسو گوہر نایاب رہتا ہے

☆☆

کبھی تو پا ہی لیں گے ہم اسے تعبیر کی صورت
جو ان بیدار آنکھوں کے لیے بھی خواب رہتا ہے

☆☆

آنکھوں سے تو نہاں ہے مگر دلنشیں تو ہے
ہر چند ہر جگہ نہیں لیکن کہیں تو ہے

ادیب اور فنکار مختلف وقتوں میں اپنے انداز بیاں اور اسلوب نگارش کا سہارا لے کر ظلم اور استحصال کرنے والی طاقتوں اور ان کے ایوانوں پر لرزہ طاری کرتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے اعصاب شکن حالات میں بھی اپنے منفرد اسلوب کے ذریعے اپنے حصے کی شمع جلا کر مہیب سناٹوں اور سفاک ظلمتوں میں اعلائے حق اور اظہار صداقت کرتا ہے۔ تابش کا اسلوب بیان بھی ایسا ہے جو استحصالی طاقتوں کے خلاف اور غریب طبقے کے حق میں آواز بلند کرتا ہے۔

اجر ِ مزدور ، در و بام کی رنگینی ہے
قصر پرویزی اسلاف کے افسانے ہیں

☆☆

حجلۂ عیش نے دیکھی ہے غلامی کی بہار
گلستان جنتِ شداد کے ویرانے میں

حقیقت پسندی تابش کے کلام اور انداز بیان دونوں کی اہم خصوصیت ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق سے دو چار ہونے پر بھی ان کی حقیقت بیانی لرزہ براندام نہیں ہوتی بلکہ مزید قوت و استقامت کی حامل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر شاہدہ حسن نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

تابش دہلوی ایک باشعور اور حقیقت پسند انسان کی حیثیت سے ان زندگی کے تقاضو ں کو نبھاتے نظر آتے ہیں۔۔۔ ایسا لگتا ہے ہر نئے دکھ اور چوٹ کے ساتھ وہ

زندگی کے سفر میں پہلے سے زیادہ بااعتماد ہوکر قدم اٹھانے لگتے ہیں۔(۳۱)

تابش دہلوی کا اسلوب شعران کی پہچان ہے۔ان کی غزلوں میں اسلوب کی کارفرمائی حد درجہ جدت کی حامل ہے اور یہی ان کی شاعری کی عمارت کو استوار کرنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔" بلاشبہ تابش کی شاعری اسلوب اظہار کی جدت ہی کی بنا پر کھری غزل کی شاعری ہے۔"(۳۲)

اسلوب میں جدت سے مراد کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے تابش دہلوی نے ایک جگہ لکھتے ہیں:

> اسلوب کے نئے پن کو میں جدت سمجھتا ہوں۔کوئی خیال نیا نہیں ہے۔صرف اسلوب اظہار خیال کو نیا پن دیتا ہے۔(۳۳)

لسانی مہارت

تابش دہلوی زبان اور بیان دونوں میں دہلی کی مستند اور ٹکسالی زبان کے مظہر تھے۔وہ شاعری میں جو زبان برتتے ہیں اس میں تمام لسانی محاسن کا خیال رکھ کر برتتے ہیں۔اردو کی مستند زبان اور لہجہ تابش کو اس وقت معلوم ہو چکا تھا جب کہ وہ ابھی بہت چھوٹے تھے۔اپنی والدہ گرامی سے تابش دہلوی نے دہلی کی معتبر اور معیاری زبان کے مزاج اور تیور سے آگاہی حاصل کی تھی۔یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تابش دہلوی کی زبان اگر معیاری اور معتبر ہے تو اس کی بنیادی وجہ اور سبب ان کی والدہ تھیں۔ان کی والدہ محترمہ کو اردو زبان پر جو دسترس حاصل تھی وہ اپنی مثال آپ تھی۔تابش دہلوی کے لسانی شعور کو ارتقا و تہذیب سے آشنا و آراستہ کرنے میں جتنا کردار ان کی والدہ کا ہے اس کی کوئی اور ہمسری نہیں کر سکتا۔ان کی والدہ ایک فصاحت و بلاغت سے آشنا ادبی مزاج و معلومات رکھنے والی خاتون تھیں۔

> مادری زبان، مادری زبان، ماں کی گود میں زبان سیکھی، سنتے آئے ہیں حقیقت تابش صاحب کی والدہ سے مل کر روشن ہوئی۔تابش صاحب کی والدہ مرحومہ کو اللہ تعالیٰ نے فصاحت و بلاغت کی جو خوبی، زبان کا جو دل موہ لینے کا انداز عطا کیا تھا کم از کم میں نے ایسا انداز اور خوبی کہیں نہیں دیکھی۔ہزاروں اشعار از بر تھے۔مثلیں، محاورے، فارسی کے فقرے نوک زبان پر تھے۔گفتگو کیا تھی، ایک طلسم تھا۔سنتے جائیے اور عش عش کرتے جائیے۔(۳۴)

تابش دہلوی کی والدہ زبان کے سلسلے میں کسی لغزش یا غلطی کو معاف نہیں کرتی تھیں۔ اس لحاظ سے وہ سخت گیر تھیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> میں نے سنگ وخشت کے قلعۂ معلی کو بار بار دیکھا مگر قلعہ کی زبان کا لطف تابش صاحب کی والدہ کو سن کر حاصل کیا۔ بلبل ہزر داستان کو پڑھا اور سنا تھا معنویت ان کی گفتگو سن کر واضح ہوئی۔۔۔۔ غلط لفظ کی سہار نہیں تھی۔ ادھر آپ نے کوئی غلط لفظ کہا اور انھوں نے ٹوکا۔ (۳۵)

مذکورہ بالا اقتباسات سے تابش دہلوی کی والدہ کی زبان، زبان کے معاملے میں انکی سخت گیری اور قلعے کی مستند زبان پر ان کی دسترس کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ تابش چوں کہ والدہ ہی کی گود میں پلے بڑھے اور انھی سے لسانی سطح پر ابتدائی اکتساب کیا اور تادم حیات دہلوی زبان سے ناطہ نہ صرف نہیں توڑا بلکہ شدت کے ساتھ اس سے وابستہ رہے لہذا ہو بہو یہی خصوصیات وخصائل ان کی زبان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ادریس صدیقی نے اس حوالے سے لکھا ہے:

> تابش صاحب۔۔۔ لفظوں کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتتے ہیں اور اس معاملے میں دوسروں کی کسی لغزش کو معاف نہیں کر سکتے بلکہ ان کا بس چلے تو غلط لفظ لکھنے اور بولنے والے کو یا تو کالے پانی بھجوا دیں یا سات برس کے لیے دلی کا زیرا دلوا دیں۔ (۳۶)

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو تابش دہلوی کی زبان کو درجہ استناد حاصل تھا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ایک جگہ اسی درجہ استناد کا یوں ذکر کرتے ہیں:

> زبان کا یہ عرفان اور ملکہ تابش صاحب کو روثے میں ملا ہے۔۔۔ چناں چہ ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' کا اطلاق صحیح معنوں میں انھیں پر ہوتا ہے۔ (۳۷)

دبستانِ لکھنو اور دبستانِ دلی کی زبان کو اردو زبان کی تاریخ میں خاص شہرت رہی ہے۔ ان دونوں دبستانوں کی زبانیں آپس میں مشترک ہونے کے باوجود اسلوب، انداز اور محاوروں کے لحاظ سے آپس میں قدرے مختلف ہیں۔ لکھنو کی شاعری کو تابش دہلوی ''طوائف کا چونچلا'' کہتے ہیں اور اسے مورد توجہ ہی نہیں سمجھتے۔ البتہ تاریخ ادب اردو میں لکھنو کی زبان اور شاعری کی ایک اہمیت اور منزلت ضرور حاصل ہے جس سے انکار کوئی دانشمندانہ اقدام نہیں۔ تابش دہلوی کی جائے پیدائش دہلی ہے اس لیے دلّی کے

لب و لہجہ اور اسلوب بیان کو ان کے ہاں اولیت حاصل ہے۔ ایسا ہونا ایک فطری امر ہے لیکن لکھنو اور دلی کے ادباء میں موجود شاعرانہ و معاصرانہ چشمک کی قدیم روایت کا تسلسل بھی کہیں کہیں ان کے ہاں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تابش دہلوی لکھنوی زبان اور لکھنوی شاعری دونوں کو ماننے کے لیے زیادہ تیار نہیں۔ بقول ڈاکٹر اسلم فرخی "تابش دہلوی چوں کہ خالص دہلوی ہیں اس لیے وہ لکھنو کی زبان اور شاعری کے کچھ زیادہ قائل نہیں۔'' (۳۸)

تابش دہلوی الفاظ کو بھی انسانوں کی طرح صاحب مزاج سمجھتے ہیں ۔ وہ الفاظ کو جان دار قرار دیتے ہیں اور ان کے استعمال میں انتہائی احتیاط برتنے کے قائل ہیں۔ اس ضمن میں تابش دہلوی ایک جگہ لکھتے ہیں:

> الفاظ ایک طرح سے جاندار ہوتے ہیں۔ مرتے اور گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ ہر لفظ اپنے ساتھ ایک تاریخ رکھتا ہے جو خود اس کی ذات میں پنہاں ہے۔ وہ گزشتہ زمانے کی تہذیب اور معاشرت کی یادگار ہے۔ (۳۹)

مذکورہ بالا اقتباس سے الفاظ اور ان کی اہمیت و افادیت کے بارے میں تابش دہلوی کے نقطۂ نظر پر بھرپور روشنی پڑتی ہے نیز اس بات کی وجہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ تابش دہلوی الفاظ کے انتخاب و استعمال کے سلسلے میں کیوں سخت گیر تھے؟ ۔ تابش کو الفاظ کے تہہ در تہہ معانی اور ان کے استعمال میں احتیاط کی اہمیت کا صرف علم ہی نہیں تھا بلکہ ان کے کلام میں مناسب اور موزوں محل استعمال سے بھی خوب واقف تھے۔ خالد علیگ نے ایک جگہ لکھا ہے۔'' تابش صاحب کا سارا کلام لفظیات کے برمحل انتخاب اور الفاظ کو برتنے کے اعلیٰ پایہ سلیقہ کی شہادت دیتا ہے۔'' (۴۰)

تابش دہلوی کی زبان میں ٹکسالیت اور قدرے مشکل پسندی کی ایک وجہ ان کا لغت کی کتابوں سے حد درجہ محبت کرنا اور غالب کی شاعری کا مداح ہونا بھی ہے۔

> تابش دہلوی کی پسندیدہ کتاب لغت اور محبوب شاعر غالب ہے۔ غور کیا جائے تو لغت اور غالب اصل میں دونوں ایک ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے سے نجات پانا مشکل ہے اور جس نے دونوں کو سمجھ رکھا ہو وہ دوسروں کے لیے برہان قاطع ثابت ہوتا ہے۔ (۴۱)

زبان کی صحت اور طریق استعمال کے سلسلے میں تابش انتہائی سخت گیر اور روایت پرست تھے۔ ان

کی یہ سخت گیری شاعروں کی دنیائے زبان میں ان کی شہرت و عزت کا باعث بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی تابش دہلوی کو ان معدودے چند لوگوں میں شمار کرتے ہیں جن سے دلی کی مستند اور ٹکسالی زبان کا اظہار ہوتا ہے۔

تابش صاحب زبان کی صحت کے بارے میں نہایت سخت گیر اور روایت پرست ہیں۔
وہ ان دو تین آدمیوں میں سے ہیں جنھیں میں دلی کا لہجہ قرار دیتا ہوں۔(۴۲)

الفاظ کے لغات و معانی پر تابش دہلوی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ وہ اپنے دوستوں اور احباب کے لیے زندہ اور چلتی پھرتی لغت کی حیثیت رکھتے تھے۔ جب بھی کسی کو کسی لفظ کے معنی متعین کرنے یا کسی کی تصدیق کرانے کی ضرورت پیش آتی تو در تابش سے رجوع کیا جاتا تھا۔ اس ضمن میں مشفق خواجہ کے نعیم میرٹھی کو لکھے گئے ایک خط کے یہ جملے قابل توجہ ہیں۔

زبان و بیان کے مسئلے پر جب کوئی مشکل پیش آتی ہے میں انھیں سے راہنمائی حاصل کرتا ہوں اور یوں مجھے لغات کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں رہتی۔ ویسے بھی میں تابش صاحب کو اسی وقت زحمت دیتا ہوں جب لغات سے میرا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔(۴۳)

تابش دہلوی کے ذخیرہ الفاظ و محاورات اور لغت دانی کے سلسلے میں مشفق خواجہ نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ بات بھی کہہ دی ہے کہ منزل تابش وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں منزل لغت اختتام پذیر ہوتی ہے۔

کتنے ہی الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال ہیں جن کا لغت میں اندراج نہیں ان سب کے معانی تک رسائی کے لیے تابش صاحب ہی کام آتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ لغات جہاں ختم ہوتے ہیں۔ تابش صاحب وہاں سے شروع ہوتے ہیں۔(۴۴)

متذکرہ بالا بیان کو اگر مبالغہ قرار دے کر کلی اتفاق کرنے سے انکار بھی کر لیا جائے تو دوسری طرف ڈاکٹر مشفق خواجہ کی اس بات سے روگردانی کی گنجائش نظر نہیں آتی جس کے مطابق "انھیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے اس کی اگر کوئی مثال دی جا سکتی ہے تو وہ انھیں کی ذات سے دی جا سکتی ہے۔"(۴۵)

بول چال اور شعر و شاعری میں برتی جانے والی زبان کے سلسلے میں تابش دہلوی کی معیار پسندی

اور زبان ولغت کی صفائی پر بہت زیادہ توجہ دینا بعض حضرات کی نظر میں کوئی مستحسن امر نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ زبان کی صفائی اور لغت پر زیادہ توجہ دینے سے بعض اوقات تابش کا کلام ابہام واہمال کا شکار ہوتا ہے۔ اس خیال سے کلی اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ اس خیال کے برعکس بعض اہل قلم کی رائے یہ ہے کہ زبان کی صحت اور لغت کے سلسلے میں تابش کی سخت گیری اور معیار پسندی ان کے کلام کو معیاری اور منفرد بنا دیتی ہے۔ تابش قدیم الفاظ ولفظیات ہی پر زور نہیں دیتے بلکہ جدید لفظیات کا فن کارانہ استعمال بھی ان کے نزدیک اہمیت کا حامل ہے۔ تابش کے سہل انگاری سے کام نہ لینے کے سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ایک جگہ لکھا ہے:

> تابش بعض دوسرے معاصر شعراء کی طرح فکروفن کے سلسلے میں سہل انگاری نہیں کرتے۔ وہ الفاظ کی تلاش میں تراکیب کی ایجاد، استعارات کے ابلاغ اور محاورات کے استعمال میں پوری توجہ صرف کرتے ہیں۔ (۳۶)

ٹکسالی زبان اور لغت کے دقیق استعمال کے باعث تفہیم میں پیدا ہونے والی مشکل کو تابش دہلوی اپنے شیریں اسلوب، برمحل لفظ کو استعمال کرنے کے سلیقے اور لفظوں کے متناسب سانچے بروئے کار لا کر سہل بنا دیتے ہیں۔ اس طرح وہ الفاظ کو لغوی باریکی سے لاتعلق ہونے دیتے ہیں نہ قاری کے لیے ناقابل تفہیم۔ علاوہ ازیں تابش دہلوی مشکل الفاظ ولغات کے تلازمے میں فارسیت کی مٹھاس اس طرح گھول دیتے ہیں کہ کلام ناقابل تفہیم اور ادق ہونے سے رہ جاتا ہے۔ چناں چہ عبداللہ خاور نے اپنے ایک مضمون میں اس حوالے سے لکھا ہے:

> تابش کا ڈکشن دراصل شیرین فارسیت سے مرکب ہے چناں چہ ان کا کلام بہ اعتبار زبان نہ تو ادق کے ذیل میں آتا ہے اور نہ سہل ممتنع کی صف میں۔ (۳۷)

غرض یہ کہ تابش دہلوی اپنی جائے پیدائش اور زبان کی شہرت وصحت وپختگی کے اعتبار سے دہلوی ہونے کا اعلان اپنے اقوال وافعال دونوں سے کرتے ہیں۔ وہ اپنے دور میں دلی کی زبان اور انداز بیان کے ترجمان تھے۔

> وہ دہلی کے رہنے والے ہیں اور اپنے پورے وجود میں اس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انھیں زبان وبیان پر حاکمانہ قدرت حاصل ہے۔ (۳۸)

طرزِ اصلاح

اصلاحِ سخن کی روایت اردو شاعری کی تاریخ میں ایک اہم روایت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اساتذۂ سخن اپنے اپنے ادوار میں اپنے شاگردوں کے اشعار و کلام میں موجود کسی بھی قسم کے فنی و فکری سقم کی اصلاح کرتے رہے ہیں۔ تابشؔ دہلوی نے کلاسیک اساتذۂ فن کی اس روایت کی بھی پاسداری کی۔ بہت سے نئے لکھنے والوں کے کلام کی اصلاح کی۔ ہوشؔ امروہوی کی معلومات کے مطابق "تابش کے تلامذہ کی تعداد پاکستان کے اساتذہ میں سب سے زیادہ ہے۔" (۴۹)

تابشؔ دہلوی کے ایک شاگرد واصل عثمانی نے اسی حوالے سے ایک مستقل مضمون بعنوان "حضرت تابش دہلوی اور ان کا طرزِ اصلاح" تحریر کیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے تابشؔ کے کئی شاگردوں کے نام بھی لکھے ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ تابشؔ سے اصلاح لینے والے سب شعراء کا نام لینا مناسب نہیں سمجھتے۔ اس ضمن میں ان کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> مجھے علم ہے کہ حضرت تابشؔ نے کیسے کیسے خود ساختہ استادانِ شعر و غزل کو مشورے دیے اور ان کے اشعار کو اپنی اصلاح سے اس لائق بنا دیا کہ اہلِ علم کی داد و تحسین کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ حضرت تابشؔ دہلوی نے اپنی فاضلانہ بصیرت سے ایسے کئی شعرا کو ایسا لائق و فائق بنا دیا ہے جو آج مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہو کر شعر و شاعری پر فلسفیانہ گفتگو کرتے، حاکمانہ طرز اختیار کرتے اور اپنی دانشوری اور دیدہ وری کا سکہ بٹھاتے ہیں۔
>
> میں نے ان کے یہاں بڑے بڑے ذی علم اور قادر الکلام شعراء کو آتے اور آپ سے مشورہ کرتے دیکھا اور سنا بھی ہے۔ مگر استاد کے امتثالِ امر کے باعث ان تمام حضرات کا نام لینا یا ریکارڈ پر لانا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں یہاں صرف ان شعراء یا شاعرات کا ذکر بر سبیلِ تذکرہ کر رہا ہوں جنھوں نے خود اپنے قلم سے اپنے استاد کا نام حضرت تابشؔ دہلوی رقم کیا ہے یا ان سے اصلاحِ سخن کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے مثلاً نظرؔ جعفری، مختارؔ فاروقی، نعیمؔ میرٹھی، رضیہؔ سبحان قریشی، نگارؔ فاروقی، پروفیسر عثمان رمزؔ وغیرہ۔ (۵۰)

واصل عثمانی نے تابشؔ دہلوی کے اصلاح کے معیار کے بارے میں لکھا ہے:

حضرت تابش دہلوی کی اصلاح اشعار کا معیار سخت ہی نہیں بلکہ بہت سخت ہے۔آپ کے اسی سخت اور شدید انداز گرفت سے سہل پسند طبائع کے اکثر شعراء اکتا کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔سستی شہرت اور "کا تا اور لے دوڑی" کی نسل سے تعلق رکھنے والے اتنی کڑی گرفت کے متحمل نہ ہو کر آپ کے دائرۂ اصلاح سے نکل جانے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔مناسب الفاظ اور ان کے موزوں استعمال پر حضرت تابش کی گہری توجہ ہوتی ہے۔(۵۱)

تابش دہلوی اصلاح دیتے وقت شاگرد کی نرم روی کی استدعا کو در خور اعتنا نہیں سمجھتے بلکہ اپنے فنی اصولوں پر سختی سے کاربند رہتے اور صاف کہہ دیتے تھے:

آپ کی خوشنودی اور دلجوئی کے لیے آپ کے اشعار پر غلط مشورہ نہیں دوں گا۔ آپ مجھ سے مشورہ کرتے ہیں تو آپ کو ان اصولوں کو برتنا پڑے گا جو میں بتاتا ہوں۔(۵۲)

تابش دہلوی غزل کی اصلاح کرتے ہوئے عموماً یہ جملے لکھا کرتے تھے:

غزل کمزور ہے۔سرسری شعر ہے۔اسے غزل کون کہے گا؟ خدا را ایسے اشعار کہنے سے گریز کیجیے اور اپنی شاعری کو خراب نہ کیجیے۔شعر کہہ کر کبھی اس کو سوچا بھی؟؟ ہر موزوں جملہ شعر نہیں ہوتا۔اس غزل کو دوبارہ کہو۔غور و فکر کیجیے۔(۵۳)

مطالعہ، محنت، مشق جیسے الفاظ ان کی اصلاح شدہ غزلوں پر ضرور نمایاں ہوتے (۵۴)

واصل عثمانی نے اپنے کئی اشعار اور ان پر دی گئی اصلاح کی مثالیں بھی پیش کی ہیں بطور مثال ایک شعر اور اس پر دی گئی تابش دہلوی کی اصلاح ملاحظہ کیجیے:

واصل عثمانی:

خس و خاشاک کی مانند پڑا رہنے دو
خود بکھر جاؤں گا میں تو نہ ہوا دے مجھ کو

اس کی اصلاح تابش دہلوی نے یوں کی ہے:

خس و خاشاک کی مانند پڑا رہنے دو
خود بکھر جاؤں گا تو یوں نہ اڑا دے مجھ کو (۵۵)

تابش دہلوی اپنے اشعار کے حوالے سے اپنے شاگردوں کو بطور نصیحت کہا کرتے تھے:

میں تو اس بات سے خوش ہوتا ہوں کہ خواہ ایک ہی آدمی میرے شعر کی تفہیم کر سکے مگر وہ شعر کے نکات اور نازک معاملات سے واقفیت رکھتا ہو۔اس میں شعر فہمی کی اعلیٰ حس ہو۔اگر وہ میرے شعر اور اس کے رموز وعلائم سے واقف ہو گیا تو میں سمجھتا ہوں کہ میری محنت وصول ہو گئی۔یہی درس وہ اپنے شاگردوں کو بھی دیتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی تمام کی تمام غزل واپس کر دیتے ہیں کہ ایک شعر بھی کام کا نہیں۔کبھی کبھی بادلِ ناخواستہ کچھ اصلاح کر کے غزل واپس کر دیتے البتہ اس پہ یہ ضرور رقم کر دیتے ہیں کہ غزل نہایت کمزور ہے، پھر سے کہیے۔(۵۶)

تصانیف

وہ ادیب اور شاعر حضرات تاریخ ادب کے مظلوم ہیں جنہوں نے خونِ جگر صرف کر کے علم و ادب کو پروان چڑھایا اور اپنی زندگی ادب پروری کے لیے وقف کر رکھی لیکن ان کی تحریریں اور زریں افکار و خیالات وارثین ادب کی سہل انگاری اور بے توجہی کے باعث زمانے کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکے اور معدوم ہو گئے۔

تابش دہلوی ایک مقتدر شاعر، ادیب، خبرنامہ نگار اور نثر نگار شخصیت تھے۔ان کی تحریریں اپنے دائرۂ تخلیق میں بیشتر اصناف ادب کو شامل کرتی ہیں۔اگر چہ اصناف شعر میں غزل ان کی پسندیدہ صنف ہے لیکن بقول سید اقبال حسین کاظمی" تابش صاحب نے غزلیات کے علاوہ دیگر اصناف سخن کو بھی اپنے تخلیقی جواہر سے مالا مال کیا ہے۔"(۵۷)

تابش دہلوی کے شعری اور نثری مجموعے درج ذیل ہیں:۔

۱۔ نیم روز — غزلیات کا مجموعہ، طبع اول ۱۹۶۳ء، طبع دوم ۱۹۸۸ء
۲۔ چراغِ صحرا — غزلیات کا مجموعہ، طبع اول ۱۹۸۳ء
۳۔ ماہ شکستہ — غزلیات کا مجموعہ، طبع اول ۱۹۹۳ء

۴۔ غبارِ انجم — نظموں کا مجموعہ، طبع اوّل ۱۹۸۳ء
۵۔ تقدیس — نعت وحمد و مرثیہ وسلام پر مشتمل مجموعہ کلام، طبع اوّل ۱۹۸۵ء
۶۔ دھوپ چھاؤں — متفرق شعری تخلیقات کا مجموعہ، طبع اوّل ۱۹۹۶ء
۷۔ دید باز دید — یادداشتوں اور نثری مضامین کا مجموعہ، طبع اوّل ۱۹۹۰ء، طبع دوم ۱۹۹۷ء۔
۸۔ کشتِ نوا — تابش دہلوی کی تمام شاعری، نثر اور متفرقات پر مشتمل کلیات جسے نعیم میرٹھی نے مرتب کیا۔ یہ کلیات ۹۹۲ صفحات پر مشتمل ہے جسے ۲۰۰۷ء میں رائٹرز بک فاؤنڈیشن امروہہ سوسائٹی کراچی نے شائع کر دیا۔

"دید باز دید" تابش دہلوی صاحب کی یادداشتوں، استاتذۂ فن کی محفلوں کی دھوم دھام اور شعرو شاعری پر لکھے گئے بعض اہم مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کے بارے میں سید حسین کاظمی ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں:

> مقامِ شکر ہے کہ حضرت تابش نے اپنی یادداشتوں کے کچھ حسین "مرقعے" اپنی خوب صورت کتاب "دید باز دید" میں محفوظ کر دیے ہیں۔(۵۸)

تابش دہلوی کے ان تمام مجموعوں اور غیر مرتبہ کلام کو کلیات کی شکل میں بھی منظرِ عام پر لایا گیا ہے جو کہ تابش کی عطا کے طور پر ذخیرۂ شعر وادب میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شامل رہے گا۔

ملازمت

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد تابش دہلوی نے ۱۹۴۱ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازمت اختیار کی۔ ابتدائی تعلیمی کے فوراً بعد ملازمت اختیار کرنا تابش کی گھریلو اور معاشی مجبوری تھی چناں چہ صہبا لکھنوی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

> میٹرک کے بعد۔۔۔ خانگی حالات کے سبب۔۔۔ ۱۹۴۱ء میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کر لی۔(۵۹)

آل انڈیا ریڈیو دہلی میں تابش بطور نیوز ریڈر یعنی خبر نامہ نگار کے اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ خبر گوئی کے لیے انھیں ایک خاص اسلوب اور دلچسپ لب ولہجہ اللہ کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ جس

کے باعث تابش جلد ہی سامعین کے دلوں میں گھر کر لیتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کی زبان اور انداز بیان میں جادو کا سا اثر تھا۔ صاف ستھری، نکھری اور ٹکسالی زبان میں جب وہ خبر پڑھتے تھے۔ سامعین ملکی وقومی اور بین الاقوامی حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے علاوہ زبان و بیان کی لطافت اور چاشنی سے محظوظ و مستفید ہوتے تھے۔ نیاز بدایونی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> جب انھوں نے نیوز ریڈر کے فرائض انجام دیے تو نہ صرف پاکستان کے اعلیٰ حکام بلکہ خبریں سننے والے تمام خاص و عام افراد اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور رہے کہ قدرت نے تابش صاحب کو نہ صرف متاثر کرنے اور دل میں اتر جانے والی آواز اور لب ولہجہ عطا کیا ہے بلکہ انھیں زبان و بیان پر کامل دسترس بھی حاصل ہے۔(۶۰)

ریڈیو پاکستان کے شعبہ خبر سے ان کی وابستگی کا سبب پطرس بخاری تھے۔ راز مرادآبادی نے اپنے ایک مضمون میں تابش کا یہ قول نقل کیا ہے۔

> بخاری صاحب نے مجھ سے کہا! تابش صاحب ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ہاں سے خبریں پڑھیں اور ادبی اعلانات کریں اور ہم فوری طور پر ڈیڑھ سو روپے آپ کو پیش کر سکیں گے۔۔۔ چناں چہ ہم نے حامی بھر لی۔(۶۱)

قیام پاکستان کے بعد جب لاہور ریڈیو سٹیشن قائم ہوا تو تابش لاہور منتقل ہوئے اس کے بعد ۱۹۵۱ء میں وہ کراچی سے خبریں پڑھنے لگے۔ اس سلسلے میں افضل صدیقی نے لکھا ہے:

> ۱۹۵۱ء میں جب ریڈیو سٹیشن۔۔۔بندر روڈ پر منتقل ہوا تو لاہور سے ریڈیو پاکستان کا شعبہ خبر کراچی منتقل کر دیا گیا اور یوں تابش صاحب بھی کراچی پہنچ گئے۔(۶۲)

تابش دہلوی مسلسل ۲۳ سال ریڈیو پاکستان کے شعبہ خبر سے منسلک رہے اور خبریں پڑھتے رہے اور آخر میں بقول نیاز بدایونی "نہایت قدر و منزلت کے ساتھ ریٹائر ہوئے۔"(۶۳)

ریڈیو سٹیشن کے شعبہ خبر میں ان کی ملازمت اگر چہ باضابطہ اور مستقل حیثیت کی حامل تھی اور بقول افضل صدیقی: "یہ ان کی واحد اور باضابطہ ملازمت تھی۔"(۶۴) تاہم اپنی خداداد تخلیقی صلاحیتوں سے خوب تر استفادہ کرنے کی لیے انھوں نے شعبۂ ترجمہ اور اسکول براڈ کاسٹنگ سے بھی وابستگی حاصل کر رکھی تھی۔

خبر گوئی میں انھوں نے اپنی ٹکسالی اور شستہ زبان اور آواز کے زیر و بم سے بلند مقام پایا۔
ترجمہ نگاری اور سکول براڈ کاسٹنگ کے شعبے کے توسط سے اردو ادب کی خدمت کا شرف حاصل کیا۔
ترجمہ نگاری اور براڈ کاسٹنگ کی ذمہ داری الفاظ کی صحت، بیان کی دلچسپی، تاریخ شعر و ادب سے آگہی
اور ناقدانہ و منصفانہ زاویۂ نظر کا تقاضا کرتی ہے اور یہ تمام تقاضے تابش خوش اسلوبی سے پورا کرتے تھے
یوں ایک قلم کار کے بقول: ''تابش دہلوی ہر شعبے کے فرائض سے بخوبی عہدہ برآ ہوتے رہے۔''(۶۵)

ترجمہ کاری سے لگاؤ اور اس میں مہارت حاصل ہونے کے اسباب میں سے ایک نمایاں اور
اولین سبب یہ تھا کہ تابش کے نانا مولوی عنایت اللہ اپنے زمانے کے مترجم تھے اور تابش نے اپنی طالب
علمی کی زندگی کا ابتدائی دور انھی کے دامن عطوفت میں گزارا تھا۔ جس کے نتیجے ان میں ذوق شعر و ادب
کے علاوہ تراجم نگاری کا شوق بھی پیدا ہوا۔

ریڈیو سے خبر گوئی (News Reading)

تابش دہلوی نے میٹرک پاس کرنے کے بعد ۱۹۳۱ء میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار
کی۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان بنا تو وہ بھی شعبۂ خبر کے ساتھ لاہور آ گئے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک وہ
لاہور ریڈیو اسٹیشن کے شعبۂ خبر سے خبریں پڑھتے رہے۔ ۱۹۵۱ء میں جب ریڈیو اسٹیشن کو کنز روڈ سے بندر
روڈ پر منتقل ہوا تو لاہور سے ریڈیو پاکستان کا شعبۂ خبر کراچی منتقل کر دیا گیا اور یوں تابش دہلوی بھی کراچی
پہنچ گئے۔ (۶۶)۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۶۳ء تک مسلسل ۲۳ سال ریڈیو پاکستان سے خبریں نشر کرتے رہے۔

تابش دہلوی کی ریڈیو سٹیشن میں ملازمت اور شعبۂ خبر سے وابستگی کا ذریعہ پطرس بخاری
تھے۔ انھوں نے تابش دہلوی کے شعر گوئی کے انداز و اسلوب کو دیکھ کر انھیں ریڈیو سٹیشن کی ملازمت کی
پیشکش کی۔ اس سارے احوال کا ذکر راز مراد آبادی نے اپنے مضمون ''سید مسعود الحسن تابش دہلوی'' کیا
ہے۔ اقتباس قدرے طویل ہے مگر دلچسپی سے خالی نہیں، ملاحظہ کیجیے:

> ایک دن سید مسعود الحسن تابش سے ریڈیو میں ملازمت کا ذکر چل نکلا تو کہنے
> لگے۔۔۔ہمیں بخاری صاحب نے اپنے گھر میں گرفتار کیا تھا۔ ان کے ہاں
> ماہانہ ادبی محفلیں ہوتی تھیں۔۔۔اس وقت کے بہت سے ادیب اور شاعر جایا
> کرتے تھے۔ شاہد بھائی مرحوم کے ساتھ ہم بھی وہاں گئے۔ وہاں طریقہ یہ تھا

کہ لوگ اپنی تحریریں اور شعر سناتے اور پھر اس پر تبادلۂ خیالات ہوتا یعنی حلقہ ارباب ذوق والا معاملہ تھا۔ ن۔ م راشد نے نظم پڑھی اور بحث چھڑی تو میں نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ مجھے اس وقت یہ خبر نہ تھی کہ بخاری صاحب کی توجہ خصوصی طور پر میری آواز پر ہے۔ جب محفل ختم ہوئی تو بخاری صاحب نے شاہد احمد دہلوی مرحوم سے کہا کہ تابش صاحب کا کیا شغل ہے؟ انھوں نے بتایا کہ حیدر آباد دکن میں ملازم ہیں لیکن یہ حضرت اپنی والدہ کے اکلوتے صاحب زادے ہیں۔ والدہ کی خواہش ہے کہ حیدر آباد کے بجائے یہیں رہیں خواہ کم ہی کمائیں۔ بخاری صاحب نے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا: شاہد صاحب انھیں کل ریڈیو اسٹیشن لے آیئے۔ چناں چہ ہم ریڈیو اسٹیشن پہنچے تو بخاری صاحب نے ہماری بڑی خاطر مدارات کی اور دلّی کے اسٹیشن ڈائریکٹر رشید احمد کو فون کر کے کہا کہ ہم لوگ فلاں اسٹوڈیو میں جا رہے ہیں آپ بھی آ جایئے۔ ابھی تک مجھے یہ علم نہ تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟ تو مجھے ایک اسٹوڈیو میں بٹھا دیا گیا اور کہا: ایک دو شعر کسی شاعر کے پڑھیں۔ اس وقت میرے ذہن میں داغ کا یہ مقطع آیا:

جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

اس کے بعد مجھ سے کہا گیا کہ یہی شعر مختلف لہجوں میں پڑھوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اب شاید لوگ میرے لہجے اور آواز دونوں سے مطمئن ہو چکے تھے۔ بخاری صاحب نے مجھ سے کہا: تابش صاحب ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ہاں سے خبریں پڑھیں اور ادبی اعلانات کریں اور ہم فوری طور پر ڈیڑھ سو روپیہ آپ کو پیش کر سکیں گے۔ میں نے کہا کہ والدہ سے دریافت کر کے دو تین دن میں جواب دوں گا۔ والدہ کے لیے یہ خبر ایسی تھی جیسے انھیں گوہر مقصود ہاتھ آ گیا ہو۔ چناں چہ ہم نے ہامی بھر لی۔ (٦٧)

تابش دہلوی خبر گوئی کے معاملے میں اپنی آواز کے زیر و بم اور تلفظ کی درستگی کے باعث اچھی شہرت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے اپنے مضمون "تابش دہلوی شخصیت اور شاعری" میں تابش کی خبر

گوئی اوران کے انداز و آواز کے حوالے سے لکھا ہے:

> یہ ریڈیو پاکستان ہے۔اب آپ مسعود تابش سے خبریں سنیے!مخصوص و منفرد انداز کی یہ آواز میں صبح کے وقت عموماً سنا کرتا۔یہ لہجہ،یہ آہنگ،یہ طرز بیان اور آواز کا زیر و بم اپنے اندر بڑی جاذبیت رکھتا۔خبریں سننے کے دوران ایسا محسوس ہوتا جیسے ہر بات دل میں اتر تی جارہی ہو۔یوں لگتا جیسے پڑھنے والا اپنی آواز کا جادو جگا رہا ہو۔(۶۸)

تابش دہلوی ۱۹۴۰ء میں دلی آ گئے اور آل انڈیا ریڈیو میں بحیثیت اناؤنسر،نیوز ریڈر ملازم ہوئے۔قیام پاکستان کے بعد(۱۹۴۷ء میں)پاکستان آئے اور ۱۹۶۳ء تک ریڈیو پاکستان کے شعبۂ خبر میں ''نیوز ریڈر'' کے فرائض نبھاتے رہے۔۱۹۶۳ء میں شعبۂ ترجمہ اور سکول براڈ کاسٹنگ سے بھی منسلک ہو گئے اور ۱۹۰۸ء میں سینئر پروڈیوسر کے عہدے پر فائز ہو گئے اور اسی عہدے سے سبکدوش ہوئے۔(۶۹)

انھوں نے ان شعبوں میں بھی اپنی ذمہ داریاں بحسن وخوبی انجام دیں۔خبر گوئی اور سکول براڈ کاسٹنگ کے شعبوں میں آواز کا زیر و بم،الفاظ کی درست ادائیگی،لفظوں کے درست معنی کا علم وادراک اور اسلوبِ بیان کی دلکشی کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔یہ تمام خوبیاں تابش دہلوی کی ذات میں بطور اتم موجود تھیں۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے یہاں بھی اپنے فرائض کو بخوبی انجام دیا۔ڈاکٹر محمود الرحمن نے تابش کی شعبۂ خبر،شعبۂ ترجمہ اور سکول براڈ کاسٹنگ سے وابستگی کے حوالے سے لکھا ہے:

> اگر اول الذکر شعبے کی اہمیت آواز کے زیر و بم پر مبنی ہے تو آخر الذکر دونوں شعبوں میں ادب کی جملہ خصوصیات کی کارفرمائی ہے۔ان میں الفاظ و انداز بیان کی صحت اور شعروادب کی تاریخ و تنقید کا بڑا خیال رکھنا پڑتا ہے۔تابش دہلوی ہر شعبے کے فرائض سے بخوبی عہدہ برآ ہوتے رہے ہیں۔(۷۰)

۳ جون ۱۹۴۷ء کو حکومتِ برطانیہ نے پاکستان کے قیام کو تسلیم کیا تھا۔اس ضمن میں کی گئی تقاریر میں سے اقلیتوں کے ترجمان سردار بلدیو سنگھ کی تقریر کا اردو ترجمہ کرنے اور اسے پڑھنے کی ذمہ داری تابش دہلوی کو سونپی گئی تھی۔(۷۱)

حکومتِ برطانیہ کی جانب سے وائسرائے ہند نے،کانگریس کی طرف سے جواہر لال نہرو نے، مسلم لیگ کی نمائندگی میں قائداعظم نے اور اقلیتوں کی جانب سے سردار بلدیو سنگھ نے تقریر کی۔سب کی

تقریریں انگریزی میں تھیں۔ قائد اعظم کی تقریر کا اردو ترجمہ ظ۔ انصاری نے کیا تھا اور انھی کو پڑھنا تھا۔ سردار بلدیو سنگھ کی تقریر کا ترجمہ تابش دہلوی کو کر کے پڑھنا تھا اور جواہر لال نہرو کی تقریر کا ترجمہ شکیل احمد کو کر کے پڑھنا تھا۔ (۷۲)

قائد اعظم کی رحلت کی المناک خبر اور قائد ملت لیاقت علی خاں کی دلدوز شہادت کی خبر بھی ریڈیو پاکستان سے تابش دہلوی نے سنائی۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کے اعلان کے علاوہ ریڈیو پاکستان سے متعلق مزید کسی یادگار واقعے کے بارے میں راز مراد آبادی کے استفسار پر تابش دہلوی نے ان سے کہا:

راز صاحب! یاد کیوں نہیں؟ یہاں بھی دو موقعے ایسے آئے جو زخم بن کر دل پر آج تک کھٹک رہے ہیں۔ ایک اعلان تھا حضرت قائد اعظم کی رحلت کا اور دوسری خبر جس نے دل خون کر دیا وہ پہلے وزیر اعظم جناب لیاقت علی خاں کی شہادت کی خبر تھی۔ یہ دونوں باتیں آج بھی یاد آ جاتی ہیں تو بے حد ملال ہوتا ہے۔ مگر خبر سناتے وقت تو نیوز ریڈر تو اپنی آواز سے نہ غم کا تاثر دے سکتا ہے نہ خوشی کا۔ (۷۳)

تابش دہلوی اپنے فرائض اور شعبۂ کار کے معاملے میں بہت اصول پسند، وقت کے پابند اور سستی و کاہل انگاری سے نفور تھے۔ سرور جاوید نے اپنے ایک مضمون "تابش دہلوی ایک تہذیبی علامت" میں اسکول براڈ کاسٹ پروگرام میں دیر سے پہنچنے پر تابش دہلوی کی تنبیہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

اسکول براڈ کاسٹ پروگرام میں جب میری طرف سے تاخیر ہوئی تو تابش صاحب نے سرد لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہہ ڈالا کہ سرور میاں ریڈیو کا نام آسان ہے مگر Entry مشکل سے ملتی ہے۔ اس سرد لہجے کی تپش بہت عرصے تک محسوس کرتا رہا اور اس کے بعد میں ریڈیو نہیں گیا۔ تابش صاحب نے بھی کبھی اس بارے میں مجھ سے فہمائش نہیں کی۔ (۷۴)

مشاعروں میں بطور نظامت کار (سٹیج سکریٹری)

تابش دہلوی نے اپنے ایک مضمون "مشاعروں کی کہانی" میں لکھا ہے:

شعر کا شوق مجھے بچپن ہی سے تھا اور یہی شوق مجھے سامع کی حیثیت سے مختلف مشاعروں میں لے گیا۔ اس زمانے میں حیدر آباد میں مشاعروں کا خاصا زور

تھا۔۔۔میں ۱۹۳۸ء کے بعد شریک ہوا۔(۷۵)

اس اقتباس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔پہلی بات یہ کہ شعر کا شوق تو تابش دہلوی کو بچپن ہی سے تھا اور وہ مشاعروں میں بطور سامع بچپن ہی سے شریک ہوا کرتے تھے۔دوسری بات یہ کہ خود تابش دہلوی نے مشاعرہ پڑھنا ۱۹۳۸ء کے بعد شروع کیا۔گویا وہ ۱۹۳۸ء تک مشاعروں میں محض سامع بن کر اساتذۂ فن کے فنی اظہار و بیان کے انداز و اسالیب کا بغور مشاہدہ کرتے رہے،سیکھتے رہے اور سنتے رہے۔مشاعروں میں اساتذۂ فن کے شعری اظہار اور تہذیبی و ادبی روایت کے جمال و کمال اور رکھ رکھاؤ کو باریک بینی سے اپنے ادراک و احساس کا حصہ بناتے رہے۔مشاعروں کی جو تفصیل انھوں نے بیان کی ہے اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ تابش دہلوی نے ان مشاعروں کو ایک عام سامع کے طور پر نہیں بلکہ ایک تہذیبی و ادبی روایت کے سچے پکے عاشق و شائق کے طور پر سنا اور ان کی معنویت کو درک کیا ہے۔فانی بدایونی،جگر مرادآبادی،جوش ملیح آبادی،نظم طباطبائی،جیسے استادانِ فن کے اعزاز میں منعقد کیے جانے والے مشاعروں میں تابش سراپا گوش بن کر شرکت کرتے تھے۔اس کی وجہ تابش دہلوی کے مندرجہ ذیل اقتباس میں ملاحظہ کیجیے:

> ان مشاعروں سے ہمارے بہت سے تہذیبی اور ادبی رشتے قائم ہیں اور انھی مشاعروں میں شاعری نے تہذیب سے اور تہذیب نے شاعری سے بہت سے سبق لیے ہیں۔(۷۶)

جب ۱۹۳۵ء میں جگر مرادآبادی پہلی بار حیدرآباد آئے تو ان کے اعزاز میں دعوتوں اور مشاعروں کی کوئی حد اور شمار ہی نہ رہا۔ہر طرف دعوت ہر جگہ مشاعرہ۔تابش نے لکھا ہے:

> ایک مشاعرہ میں نے بھی راجہ پرتاب گیر کی کوٹھی میں مولوی عبدالحق صاحب کی صدارت میں مرتب کیا۔اس میں مہاراجہ بہادر بھی شریک تھے۔مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ شعراء کی تعداد صرف چار تھی،فانی بدایونی،جگر مرادآبادی،سکندر علی وجد جو غالباً سیکنڈ ائیر میں تھے،فانی صاحب کے ایک ہندو مہمان شام اکبرآبادی۔مشاعرے کی عمدگی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ فانی نے جو شعر سنانے کے زیادہ عادی اور شوقین نہیں تھے،دس بارہ غزلیں سنائیں اور آخر میں کہنے لگے کہ میں نے زندگی بھر ایسا مشاعرہ نہیں دیکھا۔(۷۷)

مشاعروں میں شرکت کرنے اور مشاعروں کو ترتیب دینے سے تابش دہلوی نے علم مجلسی، آدابِ اظہار اور بیان کا سلیقہ سیکھا اور ان کی غزلیں قبولیت پانے میں کامیاب ہو گئیں۔

۱۹۳۰ء میں تابش دہلوی کی ایک نظم "دلی" چھپی تو میر ناصر علی جیسے قد آور ادیب نے انھیں بلوا بھیجا اور دعا دی۔ حیدرآباد میں فانی کے ہمراہ وہ مہاراجہ کشن پرشاد جیسے عظیم المرتبت شخص کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے۔۔۔ غزل پیش کی تو مہاراجہ نے نہایت بزرگانہ شفقت سے فرمایا: میاں آپ اجازت دیں تو میں اسے اپنی بیاض میں لکھ دوں؟ تابش کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا چنانچہ مہاراجہ نے چند اشعار اپنی بیاض میں ٹانک لیے اور بطور حوصلہ افزائی ایک اشرفی تابش صاحب کو عطا کی۔ (۷۸)

تابش دہلوی پاکستان آئے تو اپنے ساتھ مشاعروں کی اسی تہذیبی و ادبی فضا اور روایت کے نقوش و اثرات ساتھ لائے۔ ریڈیو پاکستان کے شعبۂ خبر کراچی سے تابش دہلوی خبر گوئی کے ساتھ ساتھ ادبی مشاعروں اور محافل کے اعلانات بھی کرتے تھے۔ پطرس بخاری کے دور میں ریڈیو پر ہفتہ وار مشاعرے نشر ہونے لگے اور بخاری صاحب کے مکان پر محفلیں جمنے لگیں۔ افضل صدیقی نے لکھا ہے:

شہر میں کسی بھی مقام پر مشاعرہ ہوتا تو ریڈیو سے وابستہ شاعر بھی مدعو ہوتے۔ بخاری صاحب کی قیادت میں بلکہ ان کی گاڑی میں ریڈیو کے شعراء کا قافلہ مشاعرے میں پہنچتا اور مشاعرہ لوٹ کر انھی کی گاڑی میں رات گئے واپس آتا۔ تابش اور ارم لکھنوی ان کے دائیں بائیں ہوتے۔ (۷۹)

تابش دہلوی مشاعروں کی نظامت کے آداب و فن اور مجلسی آداب سے خوب واقف تھے۔ ڈاکٹر محمود الرحمن نے اپنے مضمون "تابش دہلوی شخصیت اور شاعری" میں ۳۰ اگست ۱۹۵۹ء کی کے ایک مشاعرے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

۔۔۔ بعد مغرب شعرائے کرام تشریف لائے، اب مشاعرے کا آغاز ہونے والا تھا۔ مظہر خیری اٹھے اور اسٹیج سکریٹری کے لیے تابش دہلوی کا نام پیش کیا۔ کسی نے اس کی تائید بھی کی۔۔۔ اس مشاعرے میں قمر جلالوی، کوکب شادانی، نظر حیدرآبادی، ادیب سہارنپوری، رفیق خاور، وحید نسیم، ماہر القادری،

محشر بدایونی، بشیر فاروقی وغیرہ شعراء موجود تھے۔ تابش دہلوی نہایت حسن وخوبی
کے ساتھ اسٹیج سکریٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ایک تو ان کی آواز کی
گھمبیرتا، اس پر مجلسی آداب واحترام سے ان کی بھرپور واقفیت۔ یہ ایک حقیقت
ہے کہ تابش دہلوی کو علم مجلسی کا بڑا اچھا سلیقہ ہے اور اس سلیقے سے ان کی شخصیت
میں برار چاؤ اور نکھار پیدا ہوا ہے۔ یہی رچاؤ اور نکھار ان کی بدولت بزم مشاعرہ
میں بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔(۸۰)

مشاعرے کی نظامت کے فرائض نبھانے کے لیے ضروری ہے کہ نظامت کار علم مجلسی رکھتا ہو ورنہ مشاعرہ ہنگامے میں بھی تبدیل ہو سکتا ہے۔ تابش دہلوی اس اعتبار سے علم مجلسی خوب جانتے تھے۔ ادریس صدیقی نے اپنے مضمون "جائزہ" میں اس حوالے سے ایک جگہ لکھا ہے:

علم مجلسی کا جتنا بھرپور مظاہرہ کسی بڑے مشاعرے کے اسٹیج سکریٹری کو کرنا پڑتا
ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ایک طرف خواتین و حضرات کے
ہنگامے، دوسری طرف شعرائے کرام اور ان کی نازک مزاجیاں، بیک وقت
دونوں کے سامنے سرخرو ہونا آسان بات نہیں۔ مجمع پر تو شاید پولیس بھی قابو پا
سکتی ہے لیکن شاعروں کو قابو میں رکھنا سکریٹری کی ذمہ داری ہے۔ میں نے کئی
بار دیکھا کہ تابش صاحب نے یہ ذمہ داری نہایت حسن وخوبی کے ساتھ پوری
کی اور داد وصول کی۔۔۔ تابش "مشاعرے باز" شاعر تو نہیں ہیں البتہ مذکورہ
خدمات کی بنا پر انھیں "مشاعرہ نواز" کہا جا سکتا ہے۔(۸۱)

ساٹھ اور ستر کی دہائی میں تابش دہلوی کو مشاعروں کے حوالے سے وہ اعتبار حاصل تھا کہ کسی بھی بڑے سے بڑے شاعر کی شرکت یا عدم شرکت کے بارے میں تابش دہلوی کا فیصلہ آخری ہوتا تھا۔ سرور جاوید نے اپنے ایک مضمون "تابش ایک تہذیبی علامت" میں اس بارے میں لکھا ہے:

ساٹھ کی دہائی میں ہم تابش دہلوی کو پاکستان کے بڑے مشاعروں کے ٹھیکیدار کی حیثیت سے جانتے تھے جو شعراء کی فہرست مرتب کرتے تھے اور اس
طرح کے مشاعرے میں کسی بڑے کی شرکت یا عدم شرکت کے بارے میں ان
کا فیصلہ آخری ہوتا تھا اور یہ بھی مشہور تھا کہ وہ مشاعرے میں کسی کو سینئر اور کسی کو

بھی جونیئر بنا سکتے تھے۔۔۔جب یہ معلوم ہو گیا کہ تابش دہلوی بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتے تو اس احساس کا پیدا ہونا لازمی امر تھا کہ نئے شاعروں کے لیے ان کی فہرست میں کوئی گنجائش نہیں۔(۸۲)

تہذیبی و ادبی آداب و روایات کی پاسداری میں شعراء کی جانب سے سہل انگاری، شعر کی فنی باریکیوں سے شعرا کی عدم آشنائی اور معیار کلام کی کمی کے باعث مشاعروں میں تابش دہلوی کی دلچسپی میں کمی آنے لگی۔ پھر بھی وہ مشاعرے میں غیر معیاری کلام سنانے یا مشاعرے کے مزاج کے مطابق کلام لکھنے کو ناپسند کرتے تھے۔ واصل عثمانی نے لکھا ہے:

میں جب بھی ان سے گزارش کرتا ہوں کہ اپنی مشکل پسند سے ماورا کبھی مشاعرے کے مزاج کا خیال رکھ کر بھی غزل کہا کیجیے تو ان کا ایک ہی جواب ہوتا ہے "میں مشاعرے کا شاعر نہیں ہوں"۔ میں تو اس بات سے خوش ہوتا ہوں کہ خواہ ایک ہی آدمی میرے شعر کی تفہیم کر سکے۔۔۔تو میں سمجھتا ہوں کہ میری محنت وصول ہو گئی۔(۸۳)

اعزازات

تابش دہلوی پورے خلوص، انہماک اور دیانت داری کے ساتھ جہاں رہے ادب کی ترویج و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ ان کی خدمات کا دائرہ اندرون ملک اور بیرون ملک واقع کئی اداروں تک پھیلا ہوا ہے اور متعدد علمی و ادبی حلقوں اور تنظیموں کی جانب سے مختلف اوقات میں ان کی خدمات کی تعریف و تحسین ہوئی۔

ذیل میں تابش دہلوی کو اندرون ملک اور بیرون ملک سرکاری اور غیر سرکاری اداروں اور تنظیموں نیز ادبی حلقوں سے ملنے والے ایوارڈز کی ایک فہرست درج کی جاتی ہے۔

۱۔ نیشنل سوسائٹی آف پاکستان امریکن نارتھ امریکہ ایوارڈ ۱۹۸۷ء

۲۔ حلقۂ فن و ادب شمالی امریکہ ایوارڈ ۱۹۸۷ء

۳۔ کل پاکستان نعت اکادمی ایوارڈ ۱۹۹۱ء

۴۔ انجمن ترقی اردو پاکستان ایوارڈ ۱۹۹۲ء

۵۔ دہلی اینگلو عربک کالج اینڈ سکولز اولڈ بوائز ایسوسی ایشن ایوارڈ ۱۹۹۲ء

۶۔ ساکنان شہر قائد سید سلمان ندوی ایوارڈ ۱۹۹۳ء

۷۔ ہمدرد (وقف) پاکستان ایوارڈ ۱۹۹۳ء

۸۔ برٹش میٹرس اسکوپ پاکستان ایوارڈ ۱۹۹۳ء

۹۔ رائٹرز ویلفیئر فاؤنڈیشن پاکستان گولڈ میڈل ۱۹۹۴ء

۱۰۔ کراچی یونیورسٹی ایوارڈ ۱۹۹۸ء

۱۱۔ دبستان تازہ کراچی ایوارڈ ۱۹۹۸ء

۱۲۔ مہران کالج برائے خواتین کراچی ایوارڈ ۱۹۹۸ء

۱۳۔ حکومت پاکستان (صدارتی ایوارڈ) تمغہ امتیاز ۱۹۹۸ء

شخصیت ووفات

انسانی شخصیت کا اظہار جن چیزوں سے ہوتا ہے ان میں اس طرح کے طرز زیست کا عمل دخل زیادہ ہے۔ تابش دہلوی کی شخصیت پر روشنی ان کی وضعداری رکھ رکھاؤ اور نفاست پسندی سے پڑتی ہے۔ لباس کے معاملے میں تابش دہلوی قابل رشک حد تک صفائی پسند تھے۔ ان کا جسم جامہ زیب تھا جس پر لباس ایسے سجتا تھا جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔

ان کا قد میانہ، کھلتا ہوا رنگ، کسی قدر لمبا چہرہ، نہ بہت موٹے تازے نہ بالکل سینک سلائی کے حامل تھے۔ پیشانی مین کشادگی تھی اور آواز قدرے بھاری۔ جاڑوں میں شیروانی، گرمیوں میں ململ کا کرتا اور علی گڑھ کٹ پاجامہ یا کبھی کبھی بش شرٹ اور پتلون زیب تن کرتے تھے۔ مزاج میں شگفتگی، متانت اور روایات کے عناصر ایک خاص کیت وکیفیت میں موجود تھے۔ ادریس صدیقی نے لکھا ہے کہ وہ سدابہار انسان تھے۔ رکھ رکھاؤ، نفاست اور سلیقہ کا یہ عالم تھا کہ اگر کئی دن تک کپڑے بدل نہ لیں تو بھی شکن تک کپڑوں پر نہ پڑتی۔ آواز میں اگر چہ بھاری پن تھا لیکن دوران گفتگو لہجہ ہمیشہ دھیما اور ملائم ہوا کرتا تھا۔ چیخ کر کبھی نہیں بولتے تھے۔ بات ہمیشہ سوچ سمجھ کر اور تول کر کرتے تھے۔ ان کی وضعداری کا اعتراف ان کے ہر دوست نے کیا ہے۔ ان کے ایک دوست نے لکھا ہے:

تابش دہلوی سے میں پہلی بار ملا تو ان کی شرافت سے متاثر ہوا۔ دوسری ملاقات

میں ان کی ذہانت کا قائل ہونا پڑا اور تیسری ملاقات میں ان کی وضعداری کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوا۔(۸۴)

پیار محبت، خلوص و جذبہ اور ہمدردی کے گلدستے تابش دہلوی ہر شخص کو بلا تفریق سن و سال تقسیم کرتے تھے۔ اس حوالے سے وہ اپنے شاگرد، دوست، ملاقاتی، اور ہمکاروں میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے تھے۔ اپنی بساط کے مطابق ہر ضرورت مند کی مدد کرنا اپنا مذہبی اور اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔ شاگردوں کو اصلاح بڑی محنت اور شفقت سے دیتے تھے اور ان کی فکری اور عملی زندگی سے تعلق رکھنے والے پہلو ہمیشہ تابش دہلوی کی توجہ کے مرکز بنے رہتے تھے۔ نظم و ضبط کی اہمیت کو تابش خوب سمجھتے تھے۔ سلیقہ شعار اور سادگی پسند انسان تھے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ تابش صاحب "بڑے باقاعدہ انسان ہیں۔۔۔ نظم و ضبط کے عادی۔۔۔ سادگی پسند ہیں مگر سادگی میں بھی ایک آن ہے۔"(۸۵)

تابش جہاں اپنی ذات اور ملبوسات سے تعلق رکھنے والی چیزوں میں سلیقہ، قرینہ اور نظم و ضبط کے قائل تھے وہاں دوران خانہ بلکہ معاملاتِ حیات میں بھی ان امور کو ترک کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی لکھتے ہیں:

۔۔۔ زبان ہو، شاعری ہو، رہن سہن ہو، زندگی کا عام رویہ ہو تابش صاحب ہر سطح پر نفیس نظر آتے ہیں۔۔۔ نظم و ضبط کے عادی، گھر پر ان کی نشست سب سے الگ تھلگ ہے، صاف ستھری، ہر چیز قرینے کی۔ ہر چیز اپنی جگہ، کتابیں ہوں، قلم، کاغذ سب صاف ستھرے۔ مجال کیا جو کوئی چیز بے جگہ ہو۔(۸۶)

تابش دہلوی کے گھریلو ماحول کے بارے میں ڈاکٹر موصوف یوں رقم طراز ہیں:

ان کے گھر کا ماحول صاف ستھرا اور پاکیزہ ہے۔ پھولوں کی ہلکی خوشبو، کمروں میں ہلکے رنگ، نفاست کا بھرپور احساس۔(۸۷)

گھر کو پھولوں سے سجا رکھنا اور ہلکی خوشبو سے دائمی طور پر کمروں کو معطر رکھ کر نکہت بادِ بہاری کی سی فضا پیدا کرنا دراصل ذوق تابش کی بلندی اور ان کی طینت و طبیعت کی پاکیزگی کی غمازی کرتا ہے۔ ڈاکٹر محمود الرحمٰن ایک جگہ لکھتے ہیں:

ان کے گھر کا ماحول ان کی ذات کا طرح بے حد صاف ستھرا اور نکھرا ہوا ہے۔ وہ نفاست جو ان کی رگ رگ میں رچی بسی ہے در تابش سے بھی بخوبی ہویدا ہے۔(۸۸)

اسلامی تعلیمات کے مطابق صفائی پسندی نصف ایمان ہے۔ شعراء کرام عام طور پر اپنے ایمان کے اس نصف کی تکمیل کرنے سے اکثر و بیشتر پہلو تہی اور بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن تابش صاحب کا ایمان اس حوالے سے بھی درجۂ کمال کو پہنچا ہوا ہے۔ ذات اور معاملاتِ حیات میں حد درجہ صفائی شاعروں کی دنیا میں یقیناً ایک نئی، منفرد اور قابلِ ستائش بات ہے اور یہ انفرادیت تابش دہلوی کو بطورِ اتم حاصل ہے۔ ڈاکٹر محمود الرحمٰن اپنا مشاہدہ ان الفاظ میں لکھتے ہیں۔

> میں نے بہت کم شاعروں کو اتنی صاف ستھری اور نفیس زندگی گزارتے ہوئے دیکھا ہے۔ پہلی نظر میں تو گمان ہوتا ہی نہیں کہ تابش دہلوی ایک شاعر ہیں اس لیے کہ ان کی شیروانی سے لے کر جوتے تک ہر چیز باقاعدگی کی چھاپ پڑی رہتی ہے۔(۸۹)

دوستی کے سلسلے میں تابش دہلوی بہت محتاط تو تھے لیکن جن سے دوستی کا رشتہ قائم کرتے ان سے تا حیات نبھانا اپنا فرض عین سمجھتے تھے۔ وہ دوستی کی کھلی فضا میں بھی آداب و احترام کی حدود کے قائل تھے۔ اس سلسلے میں وہ قوتِ ناطقہ کی بے لگام آزادی کے حق میں نہیں تھے۔ تکلم میں کبھی کبھی تیکھا پن شامل ہوتا تو وہ الفاظ اور جملوں کو اتنی فن کاری اور احتیاط سے احاطۂ ذہن سے نکالتے کہ کسی سامع پر ذرہ برابر منفی اثر نہیں پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دفعہ مولانا ماہر القادری کی زبان دانی کے پوچھے گئے ایک سوال کا جواب تابش نے مولانا کی موجودگی میں ان الفاظ میں دیا تھا۔ ''اس اعتبار سے تو یہ گنوار ہے گنوار''(۹۰)

جواب سن کر مولانا کی جبین پر شکن پڑنے کی بجائے مسکراہٹ آ گئی۔ جس کی سب سے بڑی وجہ تابش کے کمال اور خلوص تھی۔ تابش دہلوی کے ہاں انسان کی عزتِ نفس کی بڑی قدر و اہمیت ہے خواہ وہ جو بھی ہو۔ کسی کو شرمندہ کرنے یا کسی کی حوصلہ شکنی کرنے یا کسی کی مذمت کر کے اپنی انا کو تسکین بہم پہنچانے یا کسی کا تمسخر اڑانے سے تابش دہلوی ہمیشہ دور رہے۔ صاف گوئی اور راست بازی سے محبت اور دروغ گوئی اور فضول گوئی سے انھیں نفرت تھی۔ ''خود دو ٹوک بات کہتے ہیں اور فضول باتیں سننے سے پرہیز بھی کرتے ہیں۔''(۹۱)

لوگوں سے میل جول میں خلوص اور خندہ پیشانی کا مظاہرہ کرنا تابش کی طبیعت میں شامل تھا۔ ان کے ایک شناسا کا کہنا ہے کہ تابش ان سے جب بھی ملے نہایت پیار و محبت سے ملے۔ خیر خیریت دریافت کرتے، آنے کا سبب معلوم کرتے اور جب تک ساتھ رہتے نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ ڈاکٹر

محمود الرحمٰن نے ایک جگہ لکھا ہے:

کبھی ان کے رویے سے یہ مترشح نہیں ہو پایا کہ اس وقت (کراچی کی اصطلاح میں) "busy" ہیں اور "lift" دینا نہیں چاہتے (۹۲)

تابش دہلوی ایک دیندار اور عمل پر یقین رکھنے والی شخصیت تھے۔ چناں چہ انھوں نے اسلام کی ان تعلیمات پر عمل کر کے دکھایا جن کی رو سے ایذائے مسلم ممنوع ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ حقوق الناس کی پامالی طرز معاشرت اور انداز تکلم سے بھی ہو سکتی ہے چناں چہ ان کے میل جول اور طرز گفتگو دونوں ایذا رسانی کے عناصر و انداز سے پاک تھے۔ خندہ پیشانی، اعلیٰ ظرفی، صبر و تحمل، اور حسن سلوک ان کی شخصیت کے اجزا میں شمار ہوتے تھے۔

ان کی اعلیٰ ظرفی، صبر و تحمل اور وضع داری کی داد دینی پڑتی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں قرآن حکیم کی اس آیت "قولوا للناس حسنا" پر عمل پیرا ہیں۔ (۹۳)

اشعار اکثر و بیشتر تحت اللفظ سنایا کرتے تھے۔ شعر گوئی میں فنکاری (ایکٹنگ) کرنے سے گریز کیا اور فطری اور طبعی انداز ہی میں نذر سماعت کرتے رہے۔ پوشاک اور پہناوا ہمیشہ صاف اور نفیس پہننے کے قائل تھے۔ اس حوالے سے تابش بے حد محتاط واقع ہوئے تھے۔ چناں چہ ادریس صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے:

لباس کے معاملے میں ان کی خوش ذوقی اور وضع احتیاط قابل رشک ہے۔ مجال نہیں کہ کپڑے پر ذرا سی شکن پڑ جائے کیوں کہ اس سے پہلے ان کے ماتھے پر شکن پڑ جاتی تھی۔ (۹۴)

قناعت پسندی، وضع قطع میں نفاست پسندی اور خوش خطی کا سبق دراصل تابش دہلوی نے اپنے ابتدائی زمانہ تعلیم میں ہی میں حاصل کیا تھا۔ ان کے ابتدائی معلم منشی شودیاں چوں کہ دش خط، خوش گفتار اور صفائی پسند تھے لہذا شاگرد پر بھی استاد کے یہی اثرات گہرے طور پر مرتب ہوئے۔ چناں چہ ان کے بارے میں اس رائے سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ "شودیاں نہایت نفیس طبع، خوش گفتار اور خوش خط انسان تھے یہی وضع شاگرد کی ہے۔" (۹۵)

ان کی قناعت پسندی کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایک دفعہ کسی دوست نے ان کی شیروانی کے دلکش رنگ کے باعث پوچھا کہ اسے کہاں سے نئی نئی خریدی گئی ہے۔ تابش بولے: "معاف

کیجیے سامعین یہ نئی نہیں، سترہ برس ہو گئے ہیں اس کو۔" (۹۶)

بھرپور شعری و ادبی زندگی گزارنے اور "کشتِ نوا" کو سینچنے کے بعد تابش دہلوی (۹ نومبر ۱۹۱۱ء۔۲۳ ستمبر ۲۰۰۴ء) ۹۲ سال، ۱۱ مہینے اور ۱۵ دن کی عمر پا کر بتاریخ ۲۳ ستمبر ۲۰۰۴ء بروز جمعرات بمقام کراچی ایک وسیع ادبی حلقہ احباب اور ہزاروں چاہنے والوں کو داغِ مفارقت دیتے ہوئے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اللہ انھیں غریقِ رحمت کرے۔ آمین۔

شعری نظریات

شاعری میں سوز و گداز کو بنیادی حیثیت کا حامل عنصر سمجھتے ہیں۔ سوز و گداز کے بغیر فلسفہ و حکمت کے اعلیٰ ترین خیالات بھی شاعری کے زمرے میں نہیں آتے۔

> شاعری تو سوز و گداز کے ساتھ پاکیزہ اور لطیف جذبات کے اظہار کا نام ہے۔۔۔ فلسفہ اور حکمت کے اعلیٰ ترین خیالات بھی اگر سوز و گداز کے ساتھ نظم نہیں ہوئے ہیں تو وہ شاعری سے عاری ہیں۔ یہی حال پند و نصائح کا ہے۔ رومیؔ اور سعدیؔ عظیم ترین معلم الاخلاق ہیں اور ان کی عظمت سے انکار ادبی کفر ہے۔ گلستان (نثر کی کتاب) بوستان یا مثنوی مولانا روم کو اعلیٰ شاعری کے زمرے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ پند و نصائح اور اخلاقی فلسفے کی اعلیٰ کتابیں ہیں اور رہیں گی مگر شاعری چیزے دیگر۔ (۹۷)

محبت کو شاعری کی زبان قرار دیتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ شاعری کا منصب سیاسی انقلاب برپا کرنا نہیں۔ شاعری قوموں کی فکری و تہذیبی سطح کو بلند کرتی ہے۔

> شاعری کو شاعری ہی رہنا چاہیے۔ شاعر کو قلم کا جرواہا نہیں بننا چاہیے۔ شاعری کے ذریعے ویسے بھی کوئی سیاسی انقلاب برپا نہیں ہوا ہے۔ شاعری نے قوموں کی تہذیبی، اخلاقی اور فکری سطح کو ضرور بلند کیا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہوتا رہے گا کیوں کہ شاعری محبت کی زبان ہے۔ (۹۸)

شاعری خصوصاً غزل کی تفہیم و تنقید میں شعر کے زمانہ صدور کے تہذیبی و فکری پس منظر کو پیش نظر رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یعنی بالفاظِ دیگر شاعری کو اسی کے دور کے مخصوص سماجی و تہذیبی حالات و

تناظرات میں سمجھنے کو شعری تفہیم کا اصل اور مفید طریقہ وذریعہ سمجھتے ہیں۔

غزل کے مطالعے میں ہم ادوار کا تہذیبی پس منظر پیش نظر نہیں رکھتے اور یہ الزام کہ غزل اپنے ادوار کی عکاسی نہیں کرتی، اسی کا نتیجہ ہے۔ درحقیقت غزل ہی وہ صنف شعر ہے جس نے ہمیشہ اپنے معاشرے کی پوری پوری عکاسی کی ہے۔(۹۹)

اسی ضمن میں مزید لکھتے ہیں:

غزل کے مطالعے میں یا تو بعض ادوار کی شاعری کو ہم یکسر رد کر دیتے ہیں یا اس شاعری کے ایک بڑے حصے سے ہم صرف نظر کر جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہمیں شعر کو اسی دور کے تناظر میں رکھ کر پڑھنا اور سمجھنا چاہیے جس دور میں وہ کہا گیا ہے۔(۱۰۰)

کسی بھی شاعر کو اس کا اسلوب اظہار دوسروں سے منفرد کرتا ہے۔ شاعر کا کمال اس بات میں ہے کہ اس نے قدیم اور رائج اسلوب شعر میں کتنا نیا پن پیدا کیا ہے یا اس کے اسلوب میں کتنا نیا پن ہے؟ اسی کو وہ اسلوب کی جدت بھی کہتے ہیں۔

اسلوب کے نئے پن کو میں جدت سمجھتا ہوں۔ کوئی خیال نیا نہیں ہے۔ صرف اسلوب خیال کو نیا پن دیتا ہے اور غزل کی شاعری میں اسلوب اظہار کا نیا پن بڑی مشکل سے پیدا اور حاصل ہوتا ہے۔(۱۰۱)

شعری تخلیقات میں صرف موضوع ہی اہم نہیں ہوتا بلکہ موضوع کا برتنا بھی اہمیت رکھتا ہے اور اسی کو شاعر کا اسلوب کہتے ہیں۔ اسلوب شاعر کی ذاتی قوت فکر، تخلیقی ندرت اور فنی مہارت سے حاصل ہوتا ہے اور اسلوب ہی کسی تخلیق کو ادنیٰ و اعلیٰ، عارضی اور دوامی یا صحافیانہ اور ادبی مقام پر فائز کرتا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ موضوعات غیر اہم ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بعض موضوع اہم بعض غیر اہم اور بعض اہم تر ہوتے ہیں لیکن شاعری میں ان کا انحصار فنی دلکشی اور اسلوب اظہار ہی پر ہوتا ہے۔(۱۰۲)

غزل اور نظم کو فکر وفن اور موضوع و اسلوب دونوں اعتبار سے ایک دوسرے سے الگ اصناف قرار

دیتے ہیں۔ غزل اور نظم میں سے ہر ایک کی کا موضوع اور مواد اپنے لیے مناسب ہیئت خود ہی ڈھونڈتا ہے۔ گویا ہیئت، موضوع کے مطابق تشکیل پاتی ہے۔

> غزل اور نظم کی شاعری میں بنیادی فرق ہے۔ غزل تشکیل لفظی، اختصار، ایجاز اور ابہام کا (اہمال کا نہیں) مطالبہ کرتی ہے۔ بحور اور ردیف و قافیہ کی پابندی اس کے علاوہ ہے۔ برخلاف اس کے نظم تفصیل اور تفسیر چاہتی ہے۔ اس کا ہر گوشہ وضاحت طلب ہوتا ہے۔ نظم بھی غزل کی طرح بحور کی پابند ہوتی ہے۔ (۱۰۳)

> غزل اور نظم کے مضمون اور موضوع اپنی ہیئتیں خود تلاش کرتے ہیں۔ غزل اپنے مضمون کے اعتبار سے بحر، ردیف اور قافیہ کا انتخاب خود کرتی ہے اور نظم اپنے موضوع کے اعتبار سے اپنی ہیئت خود منتخب کرتی ہے۔ وہ ہیئت پابند نظم کی بھی ہو سکتی ہے اور معرا یا آزاد نظم کی بھی۔ (۱۰۴)

فن کار یا تخلیق کار کی بڑائی اس بات میں ہے کہ وہ کتنا سچا ہے۔ یہ سچائی مذہبی سچائی نہیں بلکہ احساس و اظہار میں یگانگت و مطابقت کو ادبی و فنی سچائی کہا جاتا ہے۔

> ایک فن کار کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ جذبے اور اظہار دونوں میں سچا ہو۔ (۱۰۵)

مشاعروں کو اس اعتبار سے اہم سمجھتے ہیں کہ ان سے تہذیب و ادب کو فروغ ملتا ہے۔ شاعری اور تہذیب جب تک ایک دوسرے سے مثبت و مفید کسب و اکتساب کرتے ہیں تب تک اہم رہتے ہیں۔

> مشاعروں نے ہماری تہذیب اور ادب کو پروان چڑھایا ہے اور مشاعروں ہی میں تہذیب نے شاعری سے اور شاعری نے تہذیب سے بہت سے سبق لیے ہیں۔ کاش آئندہ بھی ایسا ہو۔ (۱۰۶)

تہذیبی ورثہ کسی شاعر کو بڑا بناتا ہے۔ گویا کسی شاعر کی بڑائی کا ایک اہم عنصر و معیار اس کی شاعری میں موجود و منعکس شدہ تہذیبی ورثے کی بڑائی ہے۔

> اصل میں وہی شاعر بڑا ہے جس کا تہذیبی ورثہ بڑا ہے اور تہذیبی ورثہ حاصل کرنے کے لیے عقل کی بزرگی ہی کام نہیں آتی بلکہ سن و سال کا پھیلاؤ بھی

ضروری ہوتا ہے۔(۱۰۷)

مذہبی شاعری میں بڑی احتیاط کو لازمی سمجھتے ہیں۔افراط وتفریط کے خدشے کے پیش نظر نعت گوئی کو ایک بہت مشکل صنفِ سخن سمجھتے ہیں۔

نعت ہو منقبت ہو یا مرثیہ شعراء کو ان اصناف میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔۔۔اور جب رسول اکرمؐ اور اہل بیت رسول کا ذکر یا مدح مقصود ہو تو اور بھی زیادہ احتیاط لازمی ہے۔(۱۰۸)

یہ اقتباس بھی ملاحظہ کیجیے جس میں اسی حوالے سے لکھا ہے:

نعت گوئی نہایت مشکل صنفِ سخن ہے۔اس سلسلے میں بعض شاعروں نے افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔۔۔نعت کا موضوع بظاہر نہایت مختصر نظر آتا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ موضوع نہایت وسیع اور مشکل موضوع ہے۔(۱۰۹)

☆☆☆

تابش دہلوی کے اساتذۂ فن اور حلقۂ احباب و معاصرین

اساتذۂ فن کی صحبت میں

شعر و شاعری سے ابتدائی عمر ہی میں رغبت و شغف کے باعث تابش دہلوی ادبی محافل و مجالس میں شرکت کرتے رہتے تھے۔ یوں مختلف مشاعروں میں انھیں اساتذۂ فن کی بلاواسطہ زیارت نصیب ہونے کے ساتھ ساتھ ان سے اکتساب کا موقع بھی فراہم ہوتا رہتا تھا۔ اساتذۂ فن کے فنی خصوصیات سے مملو کلام کو خود ان کے اسلوب و آہنگ میں سننے کے بے شمار مواقع تابش دہلوی کے نصیب میں آئے جس سے تابش دہلوی کے شعری ذوق میں استحکام اور کلام میں لفظی و معنوی سطحوں پر گہرائی و گیرائی کا سامان بہم پہنچا۔

فانی بدیوانی، ہوش بلگرامی، نظم طباطبائی، مولوی عنایت اللہ، میرزا ہادی رسوا، میرزا فرحت اللہ بیگ، میرزا یاس یگانہ اور حیرت بدایونی جیسی قدر آور شعری شخصیات اور ماہرین فن کو بلاواسطہ دیکھنے، سننے اور سمجھنے کی سعادت تابش دہلوی کو نصیب ہوئی۔ ان شخصیات میں سے بعض کے دامن عطوفت میں کئی کئی سال تابش دہلوی نے گزارے۔ اساتذۂ غزل کی صحبتوں سے تابش دہلوی کس قدر فیضیاب ہوئے اور کس حد تک ان اساتذہ سے تابش دہلوی کا تعلق رہا اس بات کا اندازہ ان کی یادداشتوں پر مبنی نثری کتاب "دید باز دید" میں شامل ان مضامین سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے اپنے محسنوں اور باکمال افراد کے سلسلے میں تحریر کیے ہیں۔ ان مضامین کو پڑھنے کے بعد ان کے نصیب کی بلندی پر رشک آتا ہے۔ مثلاً وہ اپنے عہد کی غزل کی ایک توانا اور جانی پہچانی آواز جگر مرادآبادی کے سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ان سے ایک بار ملنے کے بعد بار بار ملنے کی خواہش ہوتی۔ وہ لوگوں سے لوگوں کا ذہن ایک سطح پر لا کر ملتے۔۔۔ مجھے جگر صاحب سے نیازمندی کا شرف ۱۹۳۸ء

سے حاصل رہا لیکن ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۸ء میں جگر صاحب کا کراچی میں طویل قیام
اس شرف میں مزید اضافہ کا سبب بنا۔ان کی شفقت اور محبت میرے لیے 'کرم
ہائے تو مارا گستاخ کرد' کا مصداق تھی۔(۱)

جگر مرادآبادی ایک طرحدار شاعر غزل تھے۔مشاعروں میں شعراء کی آمد اور پھر بعض اوقات کسی کے ہاں دعوت پر جاتے بعض شعراء کی طرحداری اور عادات بھی دیدنی ہوتی ہیں۔کوئی جگر مرادآبادی کی دعوت کرتا تو وہ اپنے ساتھ ایک قافلہ شعراء بھی لیتے چلتے۔تابش دہلوی نے جگر مرادآبادی کے اس پہلوئے زیست کے بارے میں لکھا ہے:

جگر صاحب کی اگر کسی نے دعوت کی ہے تو جاتے وقت جتنے حضرات موجود ہوں
گے ان کو جگر صاحب بہ اصرار دعوت میں لے جائیں گے۔دعوت کرنے والے
بھی جگر صاحب کی اس عادت سے واقف ہوتے اور وہ اسی حساب سے
دسترخوان کا اہتمام کرتے۔(۲)

تابش دہلوی جس وقت ایوانِ غزل میں بالکل ایک نووارد کی حیثیت رکھتے تھے اس وقت جوش ملیح آبادی کی غزلیں اور شاعری، ایوانِ ادب میں گونجی تھی۔۱۹۳۹ء میں جب جوش ملیح آبادی حیدرآباد آئے تو تابش دہلوی کے نانا مولوی عنایت اللہ کے گھر کے قریب کسی جگہ اقامت اختیار کی۔تابش دہلوی کو یہیں سے جوش کی رفاقت نصیب ہوئی اور انھیں بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔اس ضمن میں تابش دہلوی کے مشاہدے کی گہرائی کا اندازہ ان کے اس مضمون سے لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے جوش پر لکھا ہے۔اس مضمون میں جوش کے حلیے اور شخصیت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

جوش صاحب نہایت خوب صورت انسان تھے۔بھرا بھرا جسم، سرخ و سفید
رنگت، حسین خط وخال، دراز قد، کشادہ پیشانی، آنکھوں میں غیر معمولی ذہانت
غرض ان کی پرکشش شخصیت ہر آدمی کے لیے جاذبیت رکھتی تھی۔(۳)

تابش دہلوی ان بزرگانِ ادب وفن کو محض وقت گزارنے کے لیے نہیں سنتے یا دیکھتے تھے بلکہ وہ ان کی فنی عظمتوں اور ادبی سرگرمیوں کو سمجھنے اور ان سے اکتساب کرنے کی خاطر ملاقاتوں اور مشاعروں میں شرکت کا سلسلہ آگے بڑھاتے تھے۔اسی لیے وہ ان بزرگانِ شعر وادب کا دیدار کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔جوش پر لکھے گئے ایک مضمون کے آخر میں انھوں نے لکھا ہے:

عظیم لوگوں کو ایک نظر دیکھ لینا بھی عظمت ہے اور مجھے یہ عظمت حاصل ہے کہ
میں نے بعض عظیم لوگ کو قریب سے دیکھا ہے۔ان عظیم لوگوں میں جوش بھی
ہیں۔(۴)

میرزا یاس یگانہ کا شمار جدید اردو غزل کے عناصر اربعہ میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ فانی بدایونی، حسرت موہانی اور یاس یگانہ ہم عصر غزل گو تھے۔ یاس یگانہ کو غالب کی عظمت واہمیت کا اعتراف نہیں تھا جب کہ فانی، غالب کو بڑا اور عظیم شاعر کہتے تھے۔ فانی بدایونی کی صحبتوں میں جب یاس یگانہ حاضر ہوتے تو ان بزرگان کے درمیان اس موضوع پر ہونے والی بحث وتمحیص کا منظر دیدنی ہوتا تھا۔ اس ضمن میں مرزا یاس یگانہ کے بارے میں تابش دہلوی نے لکھا ہے:

غالب کے طرف داروں میں فانی، حکیم آزاد انصاری، علامہ حیرت، ہوش بلگرامی
اور نواب نثار یار جنگ وغیرہ ہوتے تھے جب کہ سخن فہموں میں یاس یگانہ، جوش
ملیح آبادی، نجم آفندی وغیرہ ہوتے تھے۔ خوب خوب بحثیں ہوتیں اور ایک ایک
شعر کی وہ جراحی ہوتی کہ بس!۔(۵)

تابش دہلوی کو مولانا منظور حسین ماہر القادری سے بھی نیاز مندی کا شرف حاصل رہا۔ ماہر القادری سے تابش دہلوی کی ملاقاتوں اور گفتگو کا سلسلہ اگرچہ ۱۹۴۲ء سے شروع ہوا لیکن قیام پاکستان کے بعد اس میں وسعت آئی۔ تابش دہلوی، ماہر القادری سے اپنی ملاقاتوں اور سلسلۂ گفتگو کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

۱۹۴۳ء میں جب مستقل طور پر دلی آ گیا تو ماہر القادری صاحب دلی میں موجود
پایا۔ پھر کیا تھا وہاں بھی روزانہ ملاقات رہنے لگی ۔۔۔ ۱۹۴۹ء میں ریڈیو
پاکستان کا صدر دفتر اور خبروں کا شعبہ کراچی منتقل ہوا تو میں بھی کراچی آ گیا اور
پھر دیرینہ ملاقاتیں تازہ ہو گئیں۔ ۷۴ء سے ۷۸ء تک شاید ہی کوئی ایسا دن ہوتا
ہوگا جب ماہر صاحب سے ٹیلی فان پر کسی مشاعرے، کسی دعوت یا خود ان کے
گھر ملاقات نہ ہوتی ہو۔ وہ کبھی کبھی میرے یہاں آ جاتے۔(۶)

ماہر القادری اور تابش دہلوی کے روابط کا استحکام اور ایک دوسرے کی ذات وشخصیت میں پیوست ہونے کا اندازہ اس بات سے بھی ہو جاتا ہے کہ جب ماہر القادری دار فانی سے دار بقا کے راہی بنے تو

تابشؔ دہلوی کو یقین نہیں آیا۔ دراصل ان کا دل اس احساسِ جدائی کو قبول کرنے کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔ چناں چہ اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

> یقین نہیں آتا کہ مولانا ماہر القادری ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے ۔۔۔ یا تو ان کی شخصیت کی تازگی یہ احساس نہیں دلاتی یا اپنے تعلقات کی گہرائی اس تاثر کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہونے دیتی۔(۷)

تابشؔ دہلوی نے نہ صرف اپنے زمانے کے اساتذہ غزل کی صحبتوں سے اکتسابِ فیض کیا بلکہ دیگر اصنافِ ادب مثلاً ناول، طنز و مزاح، آزاد نظم، جدید نظم کے میدان میں شہرتِ دوام پانے والی قد آور شخصیات کی صحبتوں سے بھی مستفید ہوئے۔ اردو ادب کے مشہور طنز و مزاح نگار احمد شاہ پطرس بخاری، فنِ ناول نگاری میں ید طولیٰ رکھنے والے میرزا ہادی رسواؔ اور جدید نظم کو اردو میں رواج دینے والے شاعر ثناء اللہ ڈار المعروف بہ میرا جی اور ن۔ م۔ راشد کے ساتھ بھی تابشؔ دہلوی کی کئی صبحیں اور شامیں گزریں۔ میرا جی کی رفاقت کے سلسلے میں تابشؔ دہلوی نے لکھا ہے:

> رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ میرا جی غیر معمولی صلاحیتوں کے آدمی ہیں۔۔۔۔ یہ ملاقاتیں دوستی میں تبدیل ہوتی گئیں ۔۔۔ کبھی وہ کتب خانہ علم و ادب بھی آجاتے ۔۔۔ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے میں ادب سے لے کر فحاشی تک سینکڑوں مرحلے اور لطیفے بلا ناغہ گزرتے۔(۸)

تابشؔ دہلوی اور میرا جی کے تعلقات کا دائرہ صرف ادبی حد تک محدود نہیں تھا بلکہ ایک بے تکلف دوست اور جوع و عطش کی صورت میں وقت کی قید سے ماورا صورتوں کا حامل تھا تابشؔ دہلوی نے اس حوالے سے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

> ایک دفعہ رات کے دو بجے میرے گھر پہنچے جو دریا گنج میں ان کے گھر سے کوئی سات آٹھ میل پر تھا۔ مجھے سوتے سے اٹھایا۔ میں نے کہا خیریت؟ بولے۔ پان کھانے کو جی چاہا تھا میں نے کہا تابش کے گھر چل کر کھایا جائے۔ بس سیدھا چلا آ رہا ہوں۔(۹)

تابشؔ دہلوی کو پطرس بخاری کی صحبتیں اکثر و بیشتر میسر رہیں۔ دونوں ایک ہی شعبۂ حیات سے منسلک تھے۔ پطرس بخاری کو زمان و تجربے کے لحاظ سے تابشؔ دہلوی پر تقدم حاصل تھا۔ اس اعتبار سے

انھیں اپنے متعلقہ شعبے میں مہارت بھی حاصل تھی۔ پطرس بخاری کے ساتھ تابش دہلوی کے گزرنے والے شب و روز اور ان سے تعلقات کے بارے میں تابش دہلوی نے ایک جگہ لکھا ہے:

آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں مجھے ان سے ملاقات کا شرف کبھی حاصل نہیں ہوا۔ پہلی ملاقات ۱۹۴۷ء میں لاہور میں ہوئی۔۔۔۱۹۴۹ء میں خبروں کا شعبہ کراچی منتقل ہوا تو میں بھی کراچی آ گیا اور بخاری صاحب کے اصرار پر ان کے یہاں شام کی صحبتوں میں حاضر ہونے لگا۔۔۔ان صحبتوں میں نہایت دلچسپ موضوع زیر بحث آتے۔ ہم لوگ رات کا کھانے اکثر بخاری صاحب کے یہاں کھاتے اور رات گئے جب یہ محفلیں برخاست ہوتیں تو اپنی موٹر میں بخاری صاحب ہر شخص کو گھر چھوڑ کر آتے۔(۱۰)

تابش دہلوی نے جن اساتذۂ فن اور باکمال لوگوں کی صحبتوں سے فیض اٹھایا وہ آج اردو شعر و ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ تابش دہلوی نے ان ماہرین فن سے علمی و ادبی اور تہذیبی سطحوں پر اکتساب کیا اور اپنی شاعری کے دامن کو رنگین جواہر سے بھر دیا۔ اساتذۂ فن کے ساتھ تابش کا صرف تعلق ہی نہیں رہا بلکہ ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات بھی قائم تھے۔ بعض بزرگان ادب کے ساتھ تو گھر آنے جانے کی حد تک تابش کے مراسم تھے۔ اس ضمن میں فانی بدایونی کا نام بطور خاص قابل ذکر ہے۔ فانی بدایونی تابش دہلوی کے مربی بھی تھے اور استاد بھی۔ دیگر اساتذۂ فن کی نسبت فانی سے تابش دہلوی نے زیادہ کسب فیض کیا۔ اس سلسلے میں تفصیلی طور پر گفتگو آئندہ سطور میں کی جائے گی۔ یہاں محض یہ کہنا مقصود ہے کہ تابش دہلوی نے فانی کی صحبتوں اور محفلوں سے بھرپور استفادہ کیا اور فانی کا اثر ان پر گہرے نقوش مرتب کر گیا۔ تابش اور فانی کے درمیان مراسم کا سلسلہ بہت گہرا اور پائیدار تھا۔ اثرات بھی اسی تناسب سے مرتب ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں تابش اپنے ایک مضمون میں فانی کے اسلوب غزل گوئی اور اس کی تاثیر کے بارے میں اپنے مشاہدات ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

فانی کے شعر پڑھنے کا انداز پر تاثیر اور درد انگیز تھا۔ وہ بڑی غمگین لے میں شعر پڑھتے۔ مجھ پر ان کا بڑا گہرا اثر ہوا۔(۱۱)

فانی بدایونی کے خط و خال کا مکمل نقشہ تابش دہلوی کے دل و دماغ میں نقش تھا۔ چناں چہ ایک جگہ انھوں نے فانی بدایونی کی وضع قطع پر یوں قلم اٹھاتے ہوئے لکھا ہے:

> قد دراز، چھریرا بدن، سانولا رنگ، کشادہ پیشانی اور تیکھے نقوش، پتلی مہری کا جامہ، صوفیانہ رنگ کی شیروانی اور نرم ترکی ٹوپی چہرے پر متانت و سنجیدگی کے آثار نمایاں۔(۱۲)

تابش دہلوی نے متذکرہ بالا اساتذۂ فن کی حلیہ نگاری اور صحبتوں کی جزئیات جس تفصیل سے بیان کی ہے وہ اس بات کی غماز ہے کہ تابش دہلوی کو ان اساتذہ کی صحبتوں میں بیٹھنے، انھیں سننے اور ان سے اخذ و استفادہ کے نادر اور قابلِ رشک مواقع ملے ہیں۔ فن کی باریکیوں، غزل کی ایمائیت و اشاریت کی تہوں اور اظہار کے شائستہ و مہذب اسلوب کو تابش نے انھی اساتذہ کی صحبتوں اور ان کی نگرانی میں ہونے والے مشاعروں سے سیکھا۔

اساتذۂ غزل کی محفلوں میں اکثر بلاناغہ شرکت اور ان کے کلام کی ہمہ تن گوش بن کر سماعت کے باعث تابش کے دل و دماغ میں متذکرہ بالا ادبی شخصیتوں کے لیے بہت بڑا مقام ہوا۔ تابش ان اہلِ فن حضرات کی عزت و تکریم اپنے اوپر لازم سمجھتے تھے۔ کئی اہلِ فن اگرچہ تابش سے بلحاظ پختگی عمر و تجربہ یک گام پیچھے تھے لیکن تابش کی تہذیب اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ ان کی عزت کرنے میں کوتاہی برتی جائے۔ ان کی نظر میں اساتذۂ فن اور بزرگانِ ادب کا اپنا ایک بلند مقام تھا جس کا عمر و زمان و مکان و معیشت سے کوئی تعلق نہیں۔ اہلِ فن اور اساتذۂ فن کے سلسلے میں تابش کا نظریہ تادمِ حیات یہی رہا چناں چہ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنے ایک مضمون میں اس ضمن میں لکھا ہے:

> وہ آج بھی اپنے اساتذہ کا جن کی غالب اکثریت عمر اور تجربے میں ان سے چھوٹی ہے بڑا احترام کرتے ہیں۔ بڑی عزت سے ان کا نام لیتے ہیں۔(۱۳)

فانی بدیوانی سے ملاقات و اثرات

تابش دہلوی نے سید مسعود الحسن تابش کی حیثیت سے اپنے شعری سفر کا آغاز حیدرآباد دکن سے کیا۔ حیدرآباد میں قیام کے دوران تابش دہلوی فانی بدایونی کے بہت قریب رہے۔ فانی بدایونی سے تابش دہلوی نے بہت اثر قبول کیا۔ ڈاکٹر شکیل رضا نوازش نے اس ضمن میں لکھا ہے۔ ''جن شخصیات نے تابش دہلوی کو سب سے زیادہ متاثر کیا ان میں فانی بدایونی کا نام سرِفہرست ہے۔''(۱۳) ان کی خوش قسمتی کہیے کہ حیدرآباد میں انھیں فانی بدایونی جیسے استادِ فن میسر آئے چناں چہ تابش دہلوی بھی بقول

سرور جاوید: "فانی کے گرویدہ ہو گئے بلکہ عاشق ہو گئے۔" (۱۵)

فانی بدایونی ۱۹۳۲ء میں حیدر آباد دکن پہنچے اور ایک سکول کے ہیڈ ماسٹر کے طور پر تعینات کیے گئے۔ فانی کے دکن پہنچنے کے بعد مہاراجہ سرکشن پرشاد کی صدارت میں مشاعرے ہونے لگے۔ فانی بھی ان میں شریک ہوتے تھے۔ انھی مشاعروں میں فانی بدایونی کو تابش دہلوی نے دیکھا اور سنا۔ فانی بدایونی سے اپنی پہلی ملاقات کا احوال تابش دہلوی نے اپنے ایک مضمون " کچھ یادیں کچھ باتیں" میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> فانی بدایونی حیدر آباد آئے تو پہلے "نام پلی" اسٹیشن کے پاس "جوزف ہوٹل" میں پھر "صبح سرائے" میں مقیم ہوئے اور پھر "طے پلی" کے ایک سرکاری کوارٹر میں منتقل ہو گئے اور اپنی وفات تک یہی رہے۔ فانی کی آمد پر بھی ان کے اعزاز میں ایک مشاعرہ مہاراجہ کی صدارت میں نظامت منزل میں ہوا۔ اسی مشاعرے میں میں نے پہلی بار فانی کو دیکھا اور سنا۔ ان کے مشاعرے کے دو شعر مجھے اب تک یاد ہیں۔
>
> گرا کے قطرۂ شبنم گلوں کے دامن پر
> تجلیات کے دریا بہا دیے تو نے
> سرورِ عقل و غمِ عشق کے دوراہے پر
> بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دیے تو نے
>
> فانی کے شعر پڑھنے کا انداز بڑا پُر تاثیر اور درد انگیز تھا۔ وہ بڑی غمگین لے میں شعر پڑھتے۔ مجھ پر ان کا بڑا گہرا اثر ہوا اور میں دوسرے ہی روز ان سے ملنے جا پہنچا۔ وہ نہایت محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں ان کے یہاں تقریباً روز جانے لگا اور ان کو بھی مجھ سے ایک طرح کا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ جس روز نہ جاتا دوسرے روز میری غیر حاضری کی وجہ پوچھتے۔ (۱۶)

فانی بدایونی کی صحبت نے تابش دہلوی کو اپنا گرویدہ بنا دیا۔ تسلسل کے ساتھ ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ایک دن بقول مختار زمن تابش دہلوی نے باقاعدہ طور پر فانی بدایونی سے:

> شاگردی کے لیے درخواست کی تو فانی۔۔۔۔ نے فرمایا: "میاں شاعری درزی کا

کام نہیں کہ میں بتادوں کہ کپڑ ایوں کا تا جا تا ہے۔۔۔'' اس وقت تو ٹال دیا لیکن
غالبًا تابش صاحب کی سعادت اور عقیدت کام آئی اور آخر کار فانی ان کے کلام
پر اصلاح دینے لگے۔(۱۷)

فانؔی بدایونی اور تابشؔ دہلوی میں استاد شاگرد کا رشتہ روز بروز مستحکم ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ہو۔ تابشؔ دہلوی نے اس سلسلے میں لکھا ہے: ''جس دن میں نہ جاتا وہ خود میرے یہاں تشریف لے آتے۔'' (۱۸)

تابشؔ دہلوی کو اپنے استاد فانؔی بدایونی سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ تابشؔ دہلوی کے سامنے فانؔی بدایونی کا ذکر کیا جاتا تو تابشؔ دہلوی آبدیدہ ہو جاتے تھے۔۔مختار زمن نے اپنے مضمون ''تابشؔ دہلوی: ایک تاثر'' میں لکھا ہے:

> میں جب تابشؔ صاحب سے فانؔی کے موضوع پر گفتگو کر رہا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ استاد کے ذکر سے ان کی آنکھوں میں عقیدت کی چمک ابھر آئی۔ ان کے لہجے میں وہی کیفیت پیدا ہو گئی جو محبوب کے ذکر سے ہوتی ہے۔ وہ نہ صرف اپنے استاد کو چاہتے ہیں بلکہ انھیں عظیم شاعر ہونے کے علاوہ عظیم انسان بھی سمجھتے ہیں۔(۱۹)

تابشؔ دہلوی کی نثر اور نظم دونوں فانؔی بدایونی سے متاثر ہوئیں بلکہ یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی پوری زندگی پر فانی کے اثرات گہرے طور پر مرتب ہوئے۔ تابشؔ دہلوی کی ادبی زندگی کا اہم موڑ اس دن آیا جب فانؔی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یہ فانی بدایونی سے ملاقات ہی کا نتیجہ ہے کہ تابشؔ دہلوی کی تمام ادبی تخلیقات بالخصوص صنف غزل میں رنگ فانؔی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اس کا سبب فانؔی بدایونی کے ساتھ تابشؔ دہلوی کی دیرینہ مصاحبت کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ رنگ فانی قبول کرنے والوں کے سلسلے میں ادریس صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے:

> فانؔی کا رنگ و اثر قبول کرنے والوں کی فہرست مرتب کی جائے تو اس میں تابشؔ کا نام جلی حروف میں لکھا ہوگا بلکہ میں کہوں گا کہ یہ فہرست بھی تابشؔ ہی مرتب کر سکتے ہیں کیوں کہ وہ عرصے تک فانی کے ہم جلیسوں اور ہم نشینوں میں رہے ہیں اور ان کے معتقدوں کو اوروں سے زیادہ جانتے ہیں۔(۲۰)

شاعری میں تابش دہلوی نے فانی بدایونی سے بہت کچھ اکتساب کیا۔ ''غم'' فانی کی شاعری کا بنیادی پس منظر ہے۔ یہی پس منظر فانی کی شاعری کو خوشی کے حصول کا ذریعہ بنانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں خود تابش دہلوی اپنے ایک مضمون ''فانی اور ان کا عمومی احساس'' میں یوں رقم طراز ہیں:

فانی کی تمام شاعری کا پس منظر غم کا شدید احساس ہے۔۔۔ فانی کی شاعری میں غم کا یہ احساس خوشی کے حصول کی غمازی کرتا ہے۔ (۲۱)

تابش دہلوی کی شاعری میں بھی جذبۂ غم کو بڑی اہمیت حاصل ہے جسے یقینی طور پر فانی بدایونی کا اثر کہا جا سکتا ہے۔ فانی بدایونی اگر غم پر ''گمانِ راحتِ دنیا'' کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

ممکن نہیں ہے راحتِ دنیا کی آرزو
غم پر گمانِ راحتِ دنیا کیے بغیر

تو اُن کے شاگرد تابش دہلوی غم کو زندگی کی ایک بڑی راحت قرار دیتے ہیں۔ وہ غم کو توفیق نعمت سے بھی بعض اوقات کچھ کم نہیں سمجھتے چناں چہ کہتے ہیں:

یہ راحت زندگی میں کم نہیں ہے
کہ غم ہے اور شعورِ غم نہیں ہے

☆☆

ترے غم سے نہ ہو تسکینِ خاطر
مجھے توفیقِ نعمت کم نہیں ہے

ادب پارے میں مقصدیت کا رنگ گہرا ہو تو جمالیت اور ادبیت کو ٹھیس پہنچتا ہے۔ فانی بدایونی کے بارے میں ادریس صدیقی کہتے ہیں کہ وہ افادیت اور مقصدیت کے بجائے خالص ''شعریت'' کے قائل تھے۔ تابش کی شاعری میں بھی مقصدیت کے شکنجے سے بالاتر شعریت اور ادبیت کے جواہر نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ اپنے استاد فانی سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ نمونے کے طور پر چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ جن سے ان کی شعریت اور ادبیت پسندی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

غم بھی مسلسل ہو تو خوشی ایسی خوشی معصوم کہاں
درد بھی شاید دل بن جاتا درد مگر پیہم نہ ہوا

☆☆

واہ تمنا اب کیا چاہیں جب وہ تمنا ہی نہ رہی
آپ شریک غم نہ ہوتے دل بھی شریک غم نہ ہوا

☆☆

عشرت یاس میں کشمکش غم کب تھی
رنگ امید نے بدلا مرے کاشانے کا

☆☆

رنج ہستی بھی ہی تلخ نوائی بھی وہی
غم دنیا ہو تو نئی طرز فغاں ہوتی ہے

☆☆

شدت درد چھپائے نہیں چھپتی اے دوست
کوشش ضبط فغاں بھی تو فغاں ہوتی ہے

☆☆

دولت غم سے نا آسودہ، درد کی لذت سے محروم
تجھ کو سبب معلوم ہو شاید دل کی ناشادی کا

☆☆

ہر جفا کار سے حسرت کش آزار ہوئے
ہم سے اس عہد میں کم لوگ طرحدار ہوئے

تابش دہلوی نے فانی بدایونی سے جو اثرات قبول کیے وہ بعض اوقات اکتساب سے بڑھ کر ان کی طبیعت کا جزو اور مزاج کا حصہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ عام طور پر فانی کو "قنوطیت و یاسیت" کا شاعر کہا جاتا ہے لیکن تابش دہلوی اس خیال کی شدت سے تردید کرتے ہیں۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> فانی کی شاعری غم سے آسودگی حاصل کرنے کی ایک کوشش ہے۔ جو شخص غم سے خوشی حاصل کرتا ہو میں اسے قنوطی نہیں کہوں گا بلکہ شاید وہی مسرتیں زیادہ مستحکم ہوتی ہیں جن کے حصول کا ذریعہ غم ہو۔۔۔۔ زندگی نام ہے مر مر کے جیئے

> جانے کا نظریہ جس شخص کا اصول حیات ہو اور جو "یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی" کا نعرہ لگا کر زندگی تو زندگی موت کو بھی اپنی زندگی بنانا چاہتا ہوں اسے قنوطی کہنا درست نہیں۔ (۴۲)

تابش دہلوی بھی غم سے مسرت اور موت سے زندگی کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں۔ ان کے غم کے اجزا کو بیان کرنا چاہیں تو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ سوز و گداز، ہجر و وصال کی محرومیاں اور نامرادیاں، صبر و رضا، وفا کیشی، وفا دوستی، شکر و شکایت، سپردگی و جاں سپاری، جبر و اختیار اور احساس حسن و عشق سے ان کا غم تشکیل پاتا ہے اور اپنی شاعری کا تانا بانا وہ انھی عناصر سے بنتے ہیں۔ اس اعتبار سے بھی تابش پر فانی بدایونی کے اثرات واضح نظر آتے ہیں لیکن بقول ڈاکٹر ابوالخیر کشفی:

> مجموعی طور پر تابش کے یہاں فانی کے اثرات کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کی جلوہ گیری بھی ہے۔ (۴۳)

اس ضمن میں تابش دہلوی کے مندرجہ ذیل اشعار بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔

اس اختیار کی مجبوریوں کو کیا کہیے
یہی کہ جبر کبھی اختیار ہو نہ سکا

☆☆

جب تک الفت کی پناہوں میں نہیں تھا
دل شورش ہستی کی نگاہوں میں نہیں تھا

☆☆

دنیا شریک نعمت غم بھی نہ ہو سکی
اپنے سوا ملا نہ کوئی راز داں مجھے

☆☆

جب تمنائے غم حیات نہ تھی
دل میں دل کی سی کوئی بات نہ تھی

فانی بدایونی چوں کہ غالب کی سخنوری کے مداح تھے اور میر کی شاعری سے غم و گداز کا پہلو اکتساب کرنے کی اپنی شعوری و لاشعوری سعی پر نازاں تھے لہٰذا ان کے شاگرد تابش دہلوی کی شاعری غالب اور

میر کو یکجا کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ پروفیسر سحر انصاری اس ضمن میں ایک جگہ لکھا ہے:

> تابش دہلوی کے یہاں اگر فانی سے متاثر ہونے کی کوئی مماثلت نظر آتی ہے تو یہی کہ وہ اپنی غزل کے لب و لہجے میں میر اور غالب کو تخلیقی سطح پر یکجا کرنا چاہتے ہیں۔(۴۴)

فانؔی سے گہرے اثرات قبول کر کے دراصل تابش نے فانی کے توسط سے میرؔ و غالبؔ سے بھی اکتساب کیا یہی وجہ ہے کہ تابش کے ہاں کئی ایک غزلیں میر اور غالب کے رنگ و آہنگ میں ملتی ہیں بلکہ بعض جگہوں پر تو ان بزرگ شعراء کی زمینوں میں تابش نے شعر لکھے اور کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔

غالبؔ سے بالواسطہ متاثر ہونے کا ثبوت ان کی تخیل پسندی اور مشکل پسندی ہے۔ ستائش اور صلے سے بالاتر ہونا اور طرحداری کا ہر صورت میں قائل ہونا غالب سے متاثر ہونے کے شواہد ہیں چناں چہ سرور جاوید نے لکھا ہے:

> غالب کی مشکل پسندی اور طرحداری ان کی شاعری کی طرح ان کے مزاج میں بھی نظر آتی ہیں۔۔۔غالب۔۔۔کا نمایاں اثر اس طرح ہوا کہ تابش تخیل پسند بھی بن گئے اور غم و آلام سے ہارنے والے کی صفت بھی ان میں پیدا ہوگئی۔(۴۵)

طرحداری اور عزت نفس کے شدت سے قائل ہونے کے ساتھ دوسری طرف سے تابش انکساری اور ملنسار شاعر کے طور پر بھی سامنے آتے ہیں جس کی بنا پر وہ غالبؔ سے الگ اور فانؔی بدایونی کے مماثل اور ان سے متاثر نظر آتے ہیں۔ چناں چہ ایک اہل قلم اس ضمن میں یوں خامہ فرسا ہیں:

> یہ فانؔی کا اثر تھا کہ وہ انتہائی انکسار پسند بن گئے۔۔۔جب انکی شاعری کی تعریف میں کچھ کہا جائے تو وہ کہتے تھے۔ اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی یا خوش فہمی کبھی نہیں رہی بس شعر لکھتا ہوں اور مشق سخن جاری رکھتا ہوں۔ کیا میں کیا میری شاعری۔(۴۶)

فانؔی بدایونی کی شخصیت و شاعری کے اثرات تابش کی شخصیت و شاعری تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ ان کی نثر نگاری پر بھی مرتب ہوئے بلکہ یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تابش کی نثر نگاری کا سبب ہی فانی بنے چناں چہ ان کی نثر کا آغاز ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو ہوتا ہے۔ اس تاریخ کو چوں کہ فانی بدایونی نے دار

فانی سے دارقرار کی جانب رخت سفر باندھا تھا۔اس لیے تابش دہلوی کی نثر کا اولین مضمون "یاد ایام صحبت فانی" اپنے مشفق اور دیرینہ استاد اور مربی کی جدائی کے سلسلے میں ضبط تحریر میں آیا۔ڈاکٹر اسلم فرخی نے اس مضمون کو فانی بدایونی کی شخصیت پر سب سے بہتر مضمون قرار دیا ہے۔(۴۷)

فراق استاد پر تابش کا لکھا ہوا یہ مضمون ادبی دنیا میں شہرت پا گیا۔یہی شہرت تابش کو نثر نگاری کی طرف بھی مائل کر گئی۔مختار زمن ایک جگہ تابش کی نثر نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

> تابش صاحب نہ صرف فانی کی شخصیت اور شاعری سے متاثر ہوئے بلکہ اتفاق سے فانی ہی ان کی نثر نگاری کا سبب بنے۔تابش صاحب نے نثر کا پہلا مضمون "یاد ایام صحبت فانی" لکھا جس میں فانی کی نہایت دلکش قلمی تصویر کھینچی گئی ہے۔ان دنوں دلی میں چند ادیبوں نے ایک حلقہ بند رکھا تھا۔۔۔تابش صاحب نے اپنا مضمون اس حلقے میں پڑھا۔۱۹۴۴ء میں یہ مضمون "برہان" دہلی سے شائع ہوا تو دھوم مچ گئی۔۔۔نثر میں ہاتھ کھلا تو تابش نے تابڑ توڑ مضمون نگاری شروع کی۔(۴۸)

تابش دہلوی فانی بدایونی کی تخلیقی و ادبی شخصیت سے کس قدر متاثر تھے اس کا اندازہ اس بات سے بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ تابش نے جتنے نثری مضامین لکھے ہیں ان میں سے اکثر مضامین میں فانی کا ذکر کسی نہ کسی حوالے سے ضرور کیا ہے۔علاوہ ازیں پانچ مستقل مضامین کا تو موضوع ہی فانی بدایونی ہیں۔فانی بدایونی پر جو مضامین تابش دہلوی نے لکھے ہیں وہ درج ذیل ہیں:۔

۱۔ یاد ایام صحبت فانی

یہ مضمون تابش دہلوی کا اولین نثری نمونہ اور فانی بدایونی کی شخصیت پر بقول ڈاکٹر اسلم فرخی بہترین مضمون ہے(۴۹)

ادبی جریدہ "برہان" دہلی میں ۱۹۴۴ء میں چھپا۔

۲۔ فانی بدایونی کی شاعری میں انبساط

رسالہ "ہمدرد صحت" کراچی میں چھپا۔

۳۔ فانی اور ان کا عمومی احساس

ادبی جریدہ "آجکل" دہلی میں چھپا۔

۴۔ فانی کی شاعری میں ان کی زندگی

علی گڑھ یونیورسٹی کے مجلّے کے "فانی نمبر" میں چھپا۔

تابش دہلوی پر ادب کی فن قدر آور اور مستند شخصیات کا اثر مرتب ہوا، ان میں میر تقی میر، میرزا اسد اللہ خاں غالب، جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، اقبال، یاس یگانہ اور فانی بدایونی کے نام شامل ہیں۔ زمانی و مکانی فاصلے چوں کہ فانی بدایونی اور تابش دہلوی کے درمیان مفقود تھے اس لیے سب سے زیادہ اثرات فانی بدایونی سے قبول کیے۔ اس بات کا پہلا ثبوت تو تابش دہلوی کے کلام میں فانی بدایونی کے رنگ و آہنگ کی موجودگی ہے اور دوسرا بقول ڈاکٹر شکیل نوازش رضا:

> ثبوت کے طور پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے سب سے زیادہ مضامین فانی کی شخصیت اور شاعری پر تحریر کیے ہیں۔(۳۰)

تابش دہلوی اور فانی بدایونی کے درمیان جب مکانی فاصلہ کسی وجہ سے آ جاتا تو ملنے جلنے اور ملاقاتوں کا سلسلہ خطوط کے ذریعے برقرار رہتا۔ گویا کہا جا سکتا ہے کہ تابش دہلوی پر فانی بدایونی کے اثرات اس طرح مرتب ہوتے رہے جس طرح بیٹے پر باپ کے اثرات مرتب ہوتے ہیں چناں چہ اس بات کی تائید خود تابش دہلوی کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

> فانی مجھ سے محبت کرتے تھے اور اپنی اولاد کی طرح مجھے سمجھتے۔ جس روز میں نہ جاتا خود میرے پاس تشریف لے آتے اور میری غیر حاضری کی معقول وجہ معلوم کیے بغیر مطمئن نہ ہوتے۔ میں دلی جاتا تو خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہتا۔ افسوس ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں یہ خطوط ضائع ہو گئے۔(۳۱)

علمی و ادبی سطح پر دامن فانی سے اکتساب کرنے کے علاوہ معنوی اور روحانی اعتبار سے بھی تابش پر فانی کے اثرات مرتسم ہوئے۔ چناں چہ فانی مادیت پسندی اور سطحیت پسندی کے بجائے معنویت اور روحانیت پسندی کے قائل تھے۔ یہی میلان تابش کی طبیعت میں بھی در آیا۔ تابش دہلوی کا درد، الم اور غم کو روحانی مسرت اور بلندی درجات کا سبب کہنا فانی ہی سے متاثر ہونے اور روحانیت و معنویت کو اہمیت دینے کی گواہی دیتا ہے۔ چناں چہ اپنی ایک تصنیف "دھوپ چھاؤں" کو فانی بدایونی سے منسوب کرتے ہوئے انتساب ان الفاظ میں لکھا ہے:

> مخدوم و محترم فانی بدایونی کے نام جنھوں نے مجھے یہ سبق بھی دیا" درد کو روحانی

بنانا ترقی ہے۔(۳۲)

محرومیوں سے عشرتِ الفت کہاں نصیب
خوش ہوں کہ تیرے غم میں دل اندوگیں تو ہے

☆☆

ایک نگاہ لطف سے کیا کچھ ضبط کی قوت بڑھ جاتی
پرسش غم سے اور تو کیا ہاں دل کو سہارا ہو جاتا

☆☆

دل کی یکسوئی سے ہوتا ہے یہ ظاہر تابش
عشرتِ درد کا اب کوئی پیام آتا ہے

☆☆

تابش بصد سرور و مسرت قبول کر
اس عہد آرزو میں ہے غم بنام آرزو

☆☆

ہمنوا سرمایہ دار غم ہے میری زندگی
ہر نفس میں ایک عمر جاوداں رکھتا ہوں میں

حلقۂ احباب ومعاصرین

دوست احباب کے معاملے میں تابش دہلوی کے بارے میں ادریس صدیقی نے لکھا ہے:

دوستوں اور لفظوں کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتتے تھے اور اس معاملے میں کسی کی لغزش کو معاف نہیں کر سکتے تھے۔(۳۳)

انتخاب احباب میں معیار کے شدت سے قائل ہونے کے باوجود تابش دہلوی کے دوستوں اور ہم جلیسوں کا دائرہ دلی سے کراچی تک پھیلا ہوا تھا۔ چناں چہ جب تابش دہلوی آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازمت کرتے تھے اس وقت بھی ان کے حلقۂ ارباب بڑا وسیع تھا اور جب پاکستان آئے تب بھی احباب کا دائرہ پاکستان میں بھی روز بروز وسعت آشنا ہوتا چلا گیا۔

تابش صاحب سے ملنے جلنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع ہے۔ حیدرآباد دکن، دلی، لاہور، کراچی وہ جہاں رہے کثیرالاحباب رہے۔ ملنے جلنے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہیں۔(۳۵)

تابش دہلوی خود ایک بڑے شاعر، ادیب، فن کار اور خبر نامہ نگار تھے اس لیے "کند ہم جنس باہم جنس پرواز" کے مصداق ان کی دوستی بھی شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں سے ہوتی تھی۔ اپنے عہد کے ادیبوں اور شعراء میں ارم لکھنوی، آرزو لکھنوی، محشر بدایونی، سیماب اکبرآبادی، استاد بندو خاں، استاد بڑے غلام علی خاں، شاہد احمد دہلوی اور ادریس احمد وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

تابش دہلوی جس شاعر یا ادیب یا فن کار سے ملتے اسے اپنی خوش خلقی، خندہ پیشانی اور اخلاص کے ذریعے ہمیشہ کے لیے دوستی کے رشتے میں پرو دیتے تھے۔ محشر بدیوانی کے سلسلے میں انھوں نے ایک مقام پر لکھا ہے:

قیام پاکستان کے بعد کراچی کے ادبی حلقوں میں محشر بدایونی سے اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں اور یہ ملاقاتیں دوستی میں اور یہ دوستی محبت و یگانگت میں بدلتی گئی۔(۳۶)

قیام پاکستان سے قبل آل انڈیا دلی میں ملازمت کے دوران ان کے ساتھ چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، فیض احمد فیض، ن۔م راشد، مولانا حامد علی خاں، مختار صدیقی، خلیل الرحمٰن اور ضیا جالندھری جیسے شعراء کی دوستی تھی۔ اپنے ایک مضمون میں پطرس بخاری کی کوششوں سے منعقد کیے جانے والے ایک مشاعرے کے ہم عصر شاعر شرکا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شاعروں میں چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر تاثیر، فیض احمد فیض، ن۔م راشد، مولانا حامد علی خاں، میراجی، مختار صدیقی، خلیل الرحمٰن اور ضیا جالندھری اور میں بھی شریک تھے۔ ہمارے علاوہ اور بھی ادیب تھے۔(۳۷)

آل انڈیا ریڈیو دہلی کے توسط سے ان کی شناسائی میراجی اور ن۔م۔ ارشد جیسے جدید اور مشہور فن کاروں سے بھی ہوئی۔ چناں چہ اپنے ایک مضمون "میراجی میرا دوست" میں میراجی سے دوستی کی شروعات کا ذکر یوں کرتے ہیں:

۱۹۴۳ء کا ذکر ہے ایک دن آل انڈیا ریڈیو دلی کے براڈکاسٹنگ ہاؤس پہنچا تو ن م

راشد کے کمرے میں میراجی بیٹھے دیکھا۔۔۔یہ تھی میراجی سے میری پہلی ملاقات۔
اس کے بعد تقریباً ہر روز میراجی سے ملاقات ہوئی۔ وہ روز بروز زیادہ بے تکلف اور
قریب ہوتے گئے۔ رفتہ رفتہ یہ ملاقاتیں دوستی میں تبدیل ہو گئیں۔(۳۸)

میراجی کے توسط سے تابش دہلوی کئی نامور ادیبوں سے رشتہ دوستی میں منسلک ہو گئے اور ان کے ساتھ مل بیٹھنے کے سلسلے شروع ہوئے چناں چہ ایک جگہ وہ یوں رقم طراز ہیں:

میراجی، ن م۔ راشد، اخلاق احمد دہلوی، انصار ناصری، مختار صدیقی، خلیل الرحمٰن
اور میں دفتر کے بعد بھی ایک دوسرے کے ساتھ رہتے۔(۳۹)

جب وہ حیدر آباد تھے اس وقت ان کے دوست احباب اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں کا ذکر یوں کرتے ہیں:

حیدر آباد کے روز کے اٹھنے بیٹھنے والے دوستوں میں مرزا مظہر الحسن، برادر مرزا
ظفر الحسن یا پھر حیرت بدایونی، محمد مہدی، حمید الدین شاہد، عبد لبهاری، اعجاز الحق
قدسی، ناصر حسین، عبد السبحان، غلام دستگیر، نواب محی الدین علی خاں امیر، بشیر
میاں، حبیب احمد مخمور وغیرہ کے ساتھ میرا زیادہ وقت گزرتا۔(۴۰)

دہلی سے کراچی منتقل ہونے کے بعد یہاں جن ادیبوں اور فن کاروں سے ان کے دوستانہ مراسم رہے ان میں شعیب حزیں، رعنا اکبر آبادی، صبا اکبر آبادی، سید آل رضا، سید کاظم اور سید ہاشم رضا کے نام قابل ذکر ہیں۔ تابش دہلوی کے دوستوں اور نیاز مندوں کو حلقہ حیدر آباد دکن سے کراچی تک پھیلا ہوا تھا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

تابش صاحب کے ملنے جلنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع ہے۔ حیدر آباد دکن،
دلی، لاہور، کراچی وہ جہاں رہے کثیر الاحباب رہے(۴۱)

دوستی کے معاملے میں ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ عمر کی حدود سے بالا تر ہو کر آداب و احترام کی پاسداری سے غفلت نہیں برتتے تھے۔ بڑی خندہ پیشانی اور خلوص سے ملتے تھے۔ چناں چہ ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے لکھا ہے" تابش صاحب تو سراپا خلوص و نیاز بن کر ملتے ہیں"(۴۲)

تابش دہلوی دوستوں کے انتخاب میں معیار کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے گرد دوستوں کا حلقہ ہمیشہ وسیع ہی رہا اور بقول ادریس صدیقی:

> تابش صاحب کے دوستوں کا حلقہ ان کے دل کی طرح وسیع تھا۔ میرے خیال میں تو ساری دنیا ان کی دوست ہے کیوں کہ میں نے دشمنوں سے بھی ان کی تعریف سنی ہے۔(۴۳)

تابش دہلوی کسی دوست کی بے جا تعریف یا تنقیص کبھی نہیں کرتے تھے۔ تمام احباب سے ملنے جلنے میں مساوات اور برابری کا خیال رکھتے تھے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی ایک جگہ یوں رقم طراز ہیں:

> تابش صاحب۔۔۔ ہر شخص سے برابری کی سطح پر ملتے ہیں۔ کسی سے مرعوب نہیں نہیں ہوتے نہ کسی کی بے جا تعریف کرتے ہیں۔(۴۴)

یہی وہ خصوصیت تھی جس کی بنا پر تابش دہلوی تا دمِ حیات بزمِ دوستاں میں محبوب کی مانند ہر دل عزیز اور معزز رہے اور دوستوں کی جانب سے ملنے والے خوشیوں کے پھول سمیٹتے بھی رہے اور ان پر مسرتوں کے گل نچھاور بھی کرتے رہے۔

☆☆☆

تابش دہلوی بحیثیت غزل گو

غزلیہ مجموعوں کا مختصر تعارف

تابش دہلوی کی غزلوں کے تین مستقل مجموعے کتابی صورت میں دستیاب ہیں اور پندرہ غزلیں ان کے متفرق اصناف سخن کے مجموعے "دھوپ چھاؤں" میں شامل ہیں۔ غزل کے مستقل مجموعے بلحاظ سن اشاعت درج ذیل ہیں:

۱۔ نیم روز (اشاعت اول ۱۹۶۳ء، اشاعت دوم ۱۹۸۸ء)

۲۔ چراغ صحرا (۱۹۸۴ء)

۳۔ ماہ شکستہ (۱۹۹۳ء)

نیم روز

"نیم روز" تابش دہلوی کی غزلیات کا اولین مجموعہ ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۳ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ یہ کتاب دوسری بار ۱۹۸۸ء میں افریشیا پرنٹنگ پریس، ناظم آباد کراچی سے چھپی۔ تابش کی غزلوں کے اس اولین مجموعے کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ ڈاکٹر احسن فاروقی کے اس جملے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

> اس مجموعے کو پڑھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ تابش صاحب نے اردو غزل گوئی کو ایک نیا موڑ دے دیا ہے۔(۱)

تابش دہلوی کی لسانی و ادبی تربیت و تہذیب میں ان کی والدہ کا کردار بنیادی ترین نوعیت کا رہا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے تابش دہلوی کی والدہ گرامی کے ادبی ذوق و اور لسانی حساسیت کے بارے میں لکھا ہے:

> ہزاروں اشعار ازبر تھے۔ مثلیں، محاورے، فارسی کے فقرے نوک زبان پر

تھے۔ گفتگو کیا تھی، ایک طلسم تھا۔ سنتے جایئے اور عش عش کرتے جائیے۔۔۔
میں نے سنگ وخشت کے قلعہ معلیٰ کو بار بار دیکھا مگر قلعہ کی زبان کا لطف تابش
صاحب کی والدہ کو سن کر حاصل کیا۔ بلبل ہزار داستان کو پڑھا اور سنا تھا معنویت
ان کی گفتگو سن کر واضح ہوئی۔(۲)

والدہ گرامی کی اس ادبی وتہذیبی تربیت کا احساس تابش دہلوی کو تمام عمر رہا۔ یہی وجہ ہے کہ تابش دہلوی نے اپنی اس اولین ادبی کاوش کا انتساب اپنی والدہ گرامی کے نام کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

اپنی والدہ محترمہ کے نام جن کی آغوشِ تربیت نے میری شاعری کو پروان
چڑھایا۔(۳)

اس مجموعے میں ایک حمد بعنوان ''حمد باری تعالیٰ''، ایک نعت بعنوان ''قرآن وصاحب قرآن'' اور ۲۸۸ غزلیں شامل ہیں۔ آخر میں ''متفرقات'' کے زیر عنوان ۳۰ متفرق اشعار بھی اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔

غزلوں کے اس اولین مجموعے کا دیباچہ تابش دہلوی نے ''حرف اول'' کے عنوان سے لکھا ہے اور اس میں شاعری اور غزل کے فکری وفنی مباحث ومسائل پر تین (۳) صفحات پر محیط بحث کی ہے۔ اس دیباچے میں ''تابش دہلوی نے غزل اور غزل گوئی پر کچھ باتیں کہی ہیں جو کئی حیثیتوں سے قابل غور ہیں''(۴)

انھوں نے فن شاعری پر بحث کرتے ہوئے غزل کی اہمیت ومعنویت اور اس کے اسلوب وآہنگ پر نہایت واضح اور سلیس انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے تابش دہلوی کے اس دیباچے کو غزل کی تنقید کے سلسلے میں ایک اہم اضافہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

شروع میں تابش صاحب کا خود لکھا ہوا دیباچہ ''حرف اول'' کی سرخی کے ماتحت
ہے جسے غزل کی تنقید کے سلسلے میں اہم اضافہ کہنا چاہیے۔ اس میں غزل کا ایک
سچا فنکار اپنی مقبول صنف کی جدید دور میں اہمیت کو سیدھے اور پُر زور طریقے پر
جتاتا ہے۔(۵)

تابش دہلوی نے اپنے دیباچے میں شاعری کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتے

ہوئے لکھا ہے:

> شاعری تو سوز و گداز کے ساتھ پاکیزہ اور لطیف جذبات کے اظہار کا نام ہے۔
> ۔۔۔فلسفہ و حکمت کے اعلیٰ ترین خیالات بھی اگر سوز و گداز کے ساتھ نظم نہیں
> ہوئے ہیں تو وہ شاعری سے عاری ہیں۔(۶)

غزل کو تابش دہلوی شاعری کی اعلیٰ ترین صنف قرار دیتے ہوئے اس کی موجودہ ترقی کو دبستان دلی و لکھنؤ ہی کی مرہون منت قرار نہیں دیتے ہیں۔

> ہماری شاعری کی اعلیٰ ترین صنف غزل ہے اور صرف غزل ہی میں یہ
> خصوصیت ہے کہ وہ معاشی، معاشرتی اور سیاسی غرض ان تمام شعبہ ہائے
> حیات کو جن کا تعلق انسان اور انسان اور انسان اور کائنات کے رشتوں سے
> ہے، اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور پھر ان سے پیدا ہونے والے
> جذبات اور احساسات کو لب اظہار بخشتی ہے۔ چوں کہ ہر شخص کے
> احساسات اور جذبات مختلف ہوتے ہیں اس لیے ان کے اظہار کے پیانے
> بھی مختلف ہوتے ہیں اسی لیے موجودہ اردو غزل کی ترقی کو کسی ایک تحریک،
> کسی ایک مکتبہ خیال یا کسی ایک شخصیت سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی
> ترقی میں دلی یا لکھنؤ ہی کے مکتبہ شاعری کا ہاتھ نہیں ہے بلکہ ہر وہ خطہ زمین
> جہاں اردو کا رواج ہے، شامل ہے۔(۷)

اس مجموعے میں چھوٹی اور بڑی دونوں بحروں کی غزلیں ہیں۔ زیادہ تر غزلیں چھوٹی بحر میں نہیں۔ بعض غزلیں بہت ہی چھوٹی بحر میں ہیں بطور مثال غزل نمبر ۱۰۷، ۱۲۷، ۱۳۹، ۱۸۱، ۲۱۵، ۲۷۱، ۳۱۱، ۳۱۵ کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

ڈوبنے والا ڈوب گیا
اب طوفاں کیا ساحل کیا

☆☆

بس ایک تجلی سو عالم
پھر کوئی مقابل یاد آیا

"نیم روز" کی تمام غزلیں رنگ و آہنگ اور اسلوب و ادا کے اعتبار سے کلاسیک اردو غزل سے کی عکاس ہیں۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ مجموعہ زبان و بیان کے اعتبار سے کلاسیک غزل کی روایت کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ تابش دہلوی نے ۱۹۳۳ء میں ۱۲ سال کی عمر میں پہلا شعر کہا اور جب سے فانی سے ملاقات ہوئی تب سے وفاتِ فانی (۲۶ اگست ۱۹۴۱ء) تک ایک طویل عرصہ مسلسل اکتسابِ فن و فیض کرتے رہے مگر اپنا اولین مجموعہ غزلیات، فانی کی وفات کے تقریباً ۲۱ سال بعد تاخیر سے شائع کروادیا حالانکہ ان کی غزلیات اس سے بہت پہلے اس قابل تھیں کہ شائع کی جاتیں۔ اس دانستہ تاخیر کی وجہ سرور جاوید نے اپنے مضمون "تابش: ایک تہذیبی علامت" میں یہ بتائی ہے کہ فانی، جگر، جوش، اصغر گونڈوی جیسے غزل کے باکمال شعرا کی رفاقت نے تابش دہلوی کو Perfectionist بنا دیا تھا۔

> تابش دہلوی کے اسی نظریے کا مرہونِ منت ہے کہ ان کا پہلا شعری مجموعہ "نیم روز" انتہائی تاخیر کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا جب انھیں یقین ہو گیا تھا کہ ان کی شاعری فن کی سطح پر ہر عیب سے پاک ہے۔ (۸)

چراغِ صحرا

تابش دہلوی کی غزلیات کا دوسرا مجموعہ "چراغِ صحرا" ۱۹۸۲ء میں نوید پرنٹنگ پریس، ناظم آباد کراچی سے طبع ہوا۔ اپنے دوسرے مجموعے کا انتساب تابش دہلوی نے اپنے فرزند ارجمند مسعود تابش کے نام کیا ہے۔ مسعود تابش کے نام انتساب کرنے کی وجہ شاید تابش دہلوی کی اپنے فرزند سے وابستہ وہ امید ہے جس کا اظہار انتساب میں ان الفاظ میں ہوا ہے:

> برخوردار مسعود کے نام اس امید کے ساتھ کہ وہ میری تہذیبی روایات کو زندہ رکھیں گے۔ (۹)

اس مجموعے میں ایک حمد بعنوان "حمد ربِ دو جہاں"، ایک نعت بعنوان "نعت رسول مقبول ﷺ" چھے رباعیاں، ایک قطعہ (حضرت علیؑ پر) اور ۲۳۸ غزلیں شامل ہیں جن میں سے دو غزلیں فارسی میں ہیں۔ کتاب کے فلیپ پر ڈاکٹر احسن فاروقی، پروفیسر مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، احسان دانش، احمد ندیم قاسمی اور احمد ہمدانی کی آرا پر مشتمل تحریریں شامل ہیں۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین کی فلیپ پر مندرج تحریر سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں وہ تابش دہلوی کے کلام کو

انفرادیت اور فنی کمال کا حامل قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت تابش کی آواز اس دورِ شورآفریں میں ثقہ، سنجیدہ اور فکر خیز ہے۔ ان کے کلام کا ہر لفظ ان کے مزاج کو سمجھتا ہے اور ہر مصرعہ ان کی مخصوص شعری موسیقی کو جذب کیے ہوئے ہے۔ اسی کا نام انفرادیت ہے۔ اسی کا نام فنی تکمیل ہے اور اسی کا نام ''اپنی بات اپنی زبان میں کہنا'' ہے۔ ان کا کلام ریاضتِ نفس اور ریاضتِ فن کا اعلیٰ نمونہ ہے۔(۱۰)

''چراغِ صحرا'' میں شامل بیشتر غزلیں چھوٹی بحر کی ہیں اور نہایت سلاست و روانی کی حامل ہیں۔ بعض غزلیں اختصار و سلاست میں قابلِ رشک ہیں بطور مثال غزل نمبر ۲۰۳،۲۰۱، ۲۲۵، ۲۵۳ کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

راہِ تسلیم تلوار ہے
ہر قدم ایک سر چاہیے

سرد و گرمِ زمانہ سہیں
زندگی معتدل چاہیے !!

☆☆

تابش ہنسنا کھیل نہیں
شہر نئے ہیں، پرانے لوگ

☆☆

موج و گرداب کی سیاست میں
ناخدا ناخدا سے ڈرتا ہے

☆☆

میری دنیا، جہانِ آدم ہے
کوئی اپنے سوا نہیں اپنا

فارسی میں لکھی ہوئی غزلیں بھی اردو غزلوں کی طرح جاذبِ توجہ ہیں۔

بجوشِ پنجۂ گل در بہاراں
گریبانے و دامانے نہ داریم
فدائے بُت چہ می سازیم تابشؔ
زِ کفرِ عشق ایمانے نہ داریم

☆☆

دوریٔ صحنِ چمن داد مرا ذوقِ نوا
شد گلِ نغمۂ جاں.داغ تمنائے بہار

اس کتاب کے "حرف آغاز" میں تابش دہلوی نے غزل کی تفہیم و تعبیر میں مخصوص ادوار کے تہذیبی پس منظر کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے:

غزل کے مطالعے میں یا تو بعض ادوار کی شاعری کو ہم یکسر رد کر دیتے ہیں یا اس شاعری کے ایک بڑے حصے سے ہم صرف نظر کر جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہمیں شعر کو اسی دور کے تناظر میں رکھ کر پڑھنا اور سمجھنا چاہیے جس دور میں وہ کہا گیا ہے۔(۱۱)

پروفیسر سحر انصاری نے تابش دہلوی کی غزلوں کے اس دوسرے مجموعے کے بارے لکھا ہے:

نیم روز تابش صاحب کا پہلا مجموعہ ہے جس سے ان کا رنگ تغزل بطور خاص نمایاں ہوا لیکن تازہ مجموعہ "چراغ صحرا" زیادہ نکھرا ہوا ہے اور تابش صاحب کی تخلیقی اپچ کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔(۱۲)

"چراغ صحرا" کی غزلوں کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر سحر انصاری نے اسی مضمون میں لکھا ہے:

زبان کے سلسلے میں ایک انتہا پسندانہ رویہ تو وہ تھا جب "خالص زبان" کے شعر ساری طرز ادا کو ایک چٹکلہ بنا دیتے تھے اور اب دوسری انتہا وہ ہے کہ ہر شخص اس فکر میں ہے کہ کسی طرح نئی زبان لکھ کر دکھا دے۔۔۔ ایسے رویے کو زبان کے سلسلے میں "انارکی" سے تعبیر کرنا مناسب ہوگا۔ اس فضا میں تابش صاحب اور ان کی قبیل کے بعض شعرا کا دم بہت غنیمت ہے اور تنہا اسی خصوصیت کے

پیش نظر ان کی گزل کا مطالعہ کیا جائے تو غزل کے ایک دلکش اور متناسب طرز کا
قائل ہونا پڑے گا۔ (۱۳)

ماہِ شکستہ

تابش دہلوی کی غزلوں کا تیسرا مجموعہ "ماہِ شکستہ" ۱۹۹۳ء میں سندھ آفسٹ پرنٹرز کراچی سے طبع ہوا۔ اس مجموعے کا انتساب تابش دہلوی نے اپنے والد گرامی کے نام کیا ہے۔ اس کتاب میں ۱۳۲ غزلیں، ۱۲، قطعات، ۵۸ متفرق اشعار شامل ہیں۔ پہلے دونوں مجموعوں کی طرح اس میں بھی تابش دہلوی کا تین صفحات پر مشتمل "حرفِ آغاز" شامل ہے جس میں انھوں نے قدیم شعرا کو زبان و بیان کے بڑے اچھے پارکھ قرار دیتے ہوئے جدید شعرا کے اس خیال و رویے کو زیرِ تنقید لایا ہے کہ قدیم شاعروں کا کلام دقیانوسی ہے۔

قدیم شعرا زبان و بیان کے بڑے اچھے پارکھ تھے۔ وہ اپنے شاگردوں سے روز شعر کہلواتے اور روز پھاڑ دیتے۔ اس طرح وہ اپنے شاگردوں کو الفاظ کے مناسب استعمال کی تربیت دیتے اور مفاہیم کی نوبہ نو جہتوں سے آشنا کرتے۔ آج کا جدید شاعر قدیم شعرا کے کلام کو رد کرتا ہے اور اس کو دقیانوسی کہہ کر قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ اسے یہ نہیں معلوم کہ الفاظ کا جو ذخیرہ اور ان کے در و بست کا جو سلیقہ اُن شعرا کو میسر تھا اُس سے وہ یکسر محروم ہے۔ (۱۴)

تخلیقِ شعر میں الفاظ کے در و بست میں انتہائی احتیاط برتنے پر زور دیتے ہوئے نئے شعرا کے لیے در و بست کی بے ترتیبی کی کئی مثالیں پیش کی ہیں۔ مثلاً ملاحظہ کیجیے:

ع: ہم ،زلف کے سایے میں کچھ آرام تو لیجے

یہاں ہم ،زلف "ہم زلف" یعنی ساڑھو (سالی کا شوہر) ہو گیا ہے۔

ع: کوئی کمی نہ آئے زورِ شناوری میں

"کمی ،نہ آئے" صوتی شکل میں "کمینہ آئے" ہو گیا ہے جو صوتی ذم ہے۔

ع: پانی پانی ہے ہر اک جا ،پانی

ہر اک جا ،پانی صوتی طور پر جاپانی (قوم) ہو گیا ہے۔ (۱۵)

تابش دہلوی کی غزلوں کے تینوں مجموعوں کو ساتھ ساتھ سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو "ماہِ شکستہ" اپنی بے انتہا

سلاست وروانی کے باعث قاری کی توجہ فوراً حاصل کر لیتی ہے۔اگر چہ تابش دہلوی کی تمام غزلیں زبان وبیان اوراسلوب وآہنگ،صفائی وشستگی اور سلاست وروانی کے اعتبار سے بلا مبالغہ اعلیٰ درجے کی حامل ہیں تاہم "ماہ شکستہ" میں شامل غزلوں کی سلاست وروانی میں باکمال اورلاجواب ہیں۔بطورنمونہ چند شعر ملاحظہ کیجیے۔

غیر کا اعتبار کیونکر ہو
پہلے خود کو تو معتبر کیجیے

☆☆

تُو مرے رُو برو تو ہے، پھر بھی
پردہ سا درمیان میں کچھ ہے

☆☆

کسی کرمرمریں پیکر میں ڈھل کر
کوئی حسرت نکلنا چاہتی ہے

☆☆

اس زمانے کی دوستی تابش
آگے حدِ ادب ہے کیا کہیے

تابش دہلوی کی کتاب "دھوپ چھاؤں" میں ایک حمد،۲۴نعتیں،۱۰منقبتیں اور سلام،ایک نامکمل مرثیہ،۱۷غزلیں (۱۵اردو میں اور ۲فارسی میں ہیں)،۳۰قومی نوعیت کی نظمیں،۵۶ہائیکو(جن میں سے ۱۱ ترجمہ ہیں،بعض ہائیکو کی مقررہ بحر میں ہیں اور بعض طبع زاد ہیں)اور مختلف افراد وشخصیات پر لکھی ہوئی ذاتی نظموں اور قطعات شامل ہیں۔یہ مجموعہ کلام ۱۹۹۶ء میں چھپا۔یہ "کل پاکستان حلقہ ادب کراچی" کی ایک پیشکش ہے۔اس مجموعہ کلام میں تابش کی صرف پندرہ غزلیں شامل ہیں۔یہ غزلیات کا مستقل مجموعہ نہیں اسی لیے کتاب کا یہاں ضمناً ذکر کیا گیا ہے۔اس کتاب کا انتساب اپنے مخدوم ومربی واستاد حضرت فانی بدایونی کے نام ان لفظوں میں لکھا ہے:

مخدوم ومحترم حضرت فانی بدایونی کے نام جنھوں نے مجھے یہ سبق دیا "درد کو روحانی بنانا ترقی ہے۔(۱۶)

یہ پندرہ غزلیں بھی پہلے تین مجموعوں کی غزلوں کی مانند رواں،زبان وبیان کی صفائی وشستگی اور

واردات ومحسوساتِ قلب کے نہایت شائستہ اندازِ اظہار کی حامل ہیں۔ بطورِ مثال چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

دل میں اترے اور پیوستِ رگِ جاں ہو گئے
شعر ہیں تابشؔ غزل کے یا کوئی ابروئے دوست

☆☆

کیا تھا خلد میں ابلیس نے آدم کو گمراہ
اب آدم زاد کو گمراہ آدم زاد کرتا ہے

☆☆

جس دن سے دی گئی ہے شکست اپنے آپ کو
اُس دن سے کوئی مدِ مقابل نہیں رہا

☆☆

جو اپنی راہ سلامت روی سے چلتے ہیں
زمانہ اُن کے قدم سے قدم ملا کے چلے

تابشؔ دہلوی کی اردو میں غزلیں جس سلاست و روانی کی حامل ہیں ان کی فارسی میں لکھی ہوئی چاروں غزلیں بھی اتنی ہی سلیس و رواں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تابشؔ دہلوی نے فارسی میں بھی فنی پختگی حاصل کر رکھی تھی۔ بطورِ مثال فارسی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

ہر سحر می دہد اے حسرتِ نظارنہ حسن
شبنم آئینہ،بہ معشوق. خود آرائے بہار
تا شود تکملنہ حسرتِ نظارنہ حسن
چشم آئینہ دہد بابتِ رعنائے بہار

☆☆

تُرا دیدم من اے مُشاطہ ،اقبالِ تُرا دیدم
بدستے کاکُلِ جاناں، بدستے شانہ بُود امشب
سبو بر دوش،مینا در بغل،ساغر بکف بودش
بدیں سامان تابشؔ بر درِ میخانہ بُود امشب

تابش دہلوی کی غزلوں کا مختصر فنی وفکری جائزہ

تابش دہلوی کے شعری سفر کا آغاز جس دور سے ہوا اور شعر وادب کی جس بلندی تک انھیں رسائی حاصل ہوئی اس کا جائزہ لیتے ہوئے اسی دور کے پس منظر کو پیش نظر رکھنا لازم ہے۔

جب برصغیر میں سیاسی افق پر آزادی کی لہر زوروں پر تھی۔ دوسری جنگ عظیم کی آمد آمد تھی۔ تحریک خلافت دم توڑ چکی تھی اور تحریک پاکستان کا آغاز ہو چکا تھا۔ اودھ شاہی کی بساط الٹ چکی تھی۔ نظام حیدرآباد شاد وآباد تھے۔ فنکار حیدر آباد دکن کی طرف مراجعت کر رہے تھے۔ سماجی زندگی میں انتشار تھا۔ شرافت، خودداری، ایمانداری، صاف گوئی، سادگی اور بزرگوں کی تعظیم کو اعلیٰ اقدار سمجھا جاتا تھا۔ تابش کی شاعری کی ابتدا میں داغ کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ایک طرف اقبال کی شاعری کا شہرہ تھا تو دوسری طرف یگانہ، ساحل، حسرت، اصغر، فانی اور جگر کی شاعری کا چرچا تھا۔ جوش و فراق کی شہرت کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ رومانوی تحریک بھی زوال پذیر تھی اور کچھ وقفے سے ترقی پسند تحریک کا بھی آغاز ہو چکا تھا اور اس کے مقابلے میں حلقہ ارباب ذوق کا وجود بھی عمل میں آیا تھا اور سماجی زندگی میں ترقی پسند نظریات وافکار کا عمل دخل شروع ہو چکا تھا۔ ان حالات و واقعات اور شخصیات کے درمیان تابش دہلوی کا شعور بیدار ہوا۔ ان کے ذہن کی پرورش ہوئی اور انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ (۱۸)

تابش دہلوی نے ابتدائی عمر ہی سے اپنا رشتہ صنف غزل سے جوڑا تھا اور اسے اپنے جذبات و احساسات وفن کے اظہار کے لیے منتخب کیا گیا۔ غزل سے ان کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ۱۳/۱۲ برس کی صغرسنی میں اولین شعر غزل ہی کا کہا:

کہاں کہاں مجھے لوگ ڈھونڈ آئے
بھلا میں اس کی گلی کے سوا کہاں جاتا!!

تابش دہلوی کی غزل کا دائرہ ان کے ذہن رسا کی طرح وسیع ہے۔ وہ ایک طرف اپنے عہد میں موجود اہل کمال اور اساتذہ فن سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں دوسری طرف اپنی تہذیب وتمدن سے اخذ و

استفادہ کرتے ہیں دوسری طرف اپنی انفرادیت کا عالی شان محل پوری شان وشوکت سے تعمیر کرتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے:

> حضرت تابش نے ایک غزل گو کی حیثیت سے اس زمانے میں نام پیدا کیا جب فانی، فراق، یگانہ، اصغر، جگر اور حسرت کے سے اساتذہ فن کی غزلوں سے سارا برصغیر گونج رہا تھا۔ دنیائے شعروادب کی اتنی قدآور شخصیات کی موجودگی میں انھی کی محبوب صنفِ سخن میں ناموری حاصل کرنا مشکل کام تھا مگر تابش دہلوی کی غزل نے یہ کام کر دکھایا۔ (۱۹)

تابش دہلوی نے قیام پاکستان سے پہلے ہی غزل گوئی میں اعتبار حاصل کر لیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد تابش دہلوی جب پاکستان آئے تو اپنے ساتھ غزل گوئی کے تمام فنی ولسانی وادبی روایات و اسلوب سمیت آئے۔ قیام پاکستان کی ابتدائی دہائیوں میں غزل کو توانائی فراہم کرنے والوں میں ایک بنیادی نام تابش دہلوی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے تابش دہلوی کو آزادی کے بعد ''پاکستان میں اردو غزل کے عناصر اربعہ'' میں سے ایک قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

> پاکستان میں اردو غزل کے عناصر اربعہ میں تابش دہلوی کا شمار اس لیے ضروری ہے کہ انھوں نے اپنا بچپن اردو غزل کے قدیم دیاروں میں گزارا۔ عنفوان شباب میں جدید غزل کے قرینے میں آئے (۲۰)

تابش دہلوی نے جب شاعری شروع کی اس وقت ایوان غزل میں فراق گورکھپوری، جگر مراد آبادی، اصغر گونڈوی، مولانا حسرت موہانی اور فانی بدایونی جیسی قدآور شخصیات مسند نشین تھیں۔ اس اعتبار سے ان کی غزلوں کا ایک تعلق ایک طرف ان بزرگان غزل سے قائم ہوتا ہے اور دوسری طرف چوں کہ قیام پاکستان سے کچھ مدت پہلے اور اسی طرح بعد کے شعرائے غزل کا زمانہ بھی دیکھا اور اسی میں سانس لیتے ہوئے غزلیں کہیں اس لحاظ سے ان کی غزلوں کا دوسرا پہلو جدید زمانے اور قیام پاکستان کے بعد کی غالوں سے ملتا ہے۔ اس پس منظر میں کہا جا سکتا ہے کہ تابش قیام پاکستان سے پہلے کی کلاسک غزلوں کی علم بردار شاعری اور قیام پاکستان کے بعد ظہور پذیر ہونے والی جدید شاعری کی علم بردار شاعری کے درمیان ایک سنگم اور پل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس بات کا احساس تابش دہلوی کو خود بھی تھا جس کا اظہار انھوں نے اپنی غزلوں کے دوسرے مجموعے'' چراغ صحرا'' کے حرف آغاز میں ان الفاظ

میں کیا ہے:

''میں خود بھی قدیم و جدید کے سنگم پر کھڑا ہوں اس لیے میری ان غزلوں میں
آپ کو دونوں دھارے بہتے نظر آئیں گے۔''(۲۱)

ڈاکٹر انور سدید نے اس ضمن میں ایک جگہ لکھا ہے:

اس میں قدیم کی کلاسیکی مرصع کاری بھی ہے اور جدید ڈکشن میں معاصریت کی
جھلکیاں بھی صاف نظر آتی ہیں۔قدامت اور جدیدیت کے سنگم پر تابش دہلوی
مجھے ایک ایسے مینارہ نور کی مثال نظر آتے ہیں جس کی روشنی راستوں کو منور کرتی
ہے اور نو واردان راہ کو نئی منزلوں کا پتہ دیتی ہے۔(۲۲)

اسی حوالے سے ڈاکٹر شکیل نوازش رضا نے ان کی غزلوں کی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک
جگہ یوں لکھا ہے:

ایسی شاعری نہیں کرتے جو صرف روایت کی پاسداری کے لیے کی جاتی ہے۔وہ
روایت سے اپنا رشتہ استوار کرتے ہوئے جدید دور کے تقاضوں کو فراموش نہیں
کرتے۔ان کی شاعری روایت اور جدیدیت کا سنگم ہے۔(۲۳)

تابش دہلوی نے نظمیں، مرثیے، سلام، ہائیکو بھی لکھے ہیں لیکن ان کا اصل میدان غزل
ہے۔بارگاہ غزل سے وہ ابتدا سے آخر دم تک متمسک رہے۔جس وقت تابش دہلوی نے غزلیں لکھنی
شروع کیں اس سے کچھ مدت پہلے ہندوستان بھر میں نواب مرزا داغ دہلوی کی غزل گوئی اور استادی کا
ڈنکا بج رہا تھا اور اردو شاعری میں شیخ امام بخش ناسخ کے اثرات نظر آرہے تھے۔رئیس المتغزلین مولانا
فضل الحسن حسرت موہانی کی آمد جب ایوان غزل میں ہوئی تو شاعری (غزل) کی فضا یکسر تبدیل
ہوگئی۔اقبال کی شاعری بھی ایک توانا آواز بن کر گونج رہی تھی۔حسرت موہانی، جگر مراد آبادی، فانی
بدایونی اور اصغر گونڈوی اردو غزل میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کررہے تھے۔جوش ملیح آبادی اور فراق
گورکھپوری بھی شہرت کے زینے تیزی سے چڑھ رہے تھے۔ترقی پسند تحریک بھی آگے بڑھ رہی تھی اور
زندگی کے مختلف شعبوں خصوصاً ادب پر اثر انداز ہو رہی تھی۔اس مجموعی پس منظر میں تابش دہلوی نے
غزل سے اپنا رشتہ نہ صرف مضبوطی سے جوڑا بلکہ اس میں اپنا نام و مقام بھی پیدا کیا۔

اپنے دور کے مختلف افکار و خیالات، شخصیات و واقعات سے تاثر قبول کرکے جو

شخصیت تعمیر ہوئی اس کا نام تابش دہلوی ہوا (۲۴)

تابش دہلوی نے غزل گوئی کو اپنے باطن کا عکاس بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں سوز و گداز کے عناصر بکثرت ملتے ہیں۔ رمزیت، ایمائیت، اشاریت ان کی غزلوں کی خصوصیات ہیں۔ یہی خصوصیات تابش دہلوی کی ذات میں بھی موجود تھیں۔

> غزلوں میں سو رمزیت، اشاریت اور ایمائیت ہونی چاہیے وہ تابش دہلوی کی نظروں میں بھی نظر آتی ہے۔ (۲۵)

دہلوی ہونے کے اعتبار سے تابش کی زبان میں دہلویت کی بہت گہری چھاپ تھی۔ انھیں تادم حیات دہلی سے متمسک رہنے پر فخر تھا۔ چناں چہ ایک شعر میں انھوں نے اس بات کی طرف واضح طور پر توجہ دلائی ہے:

تابش وہ شہر حسن کہ دلی ہے جس کا نام
وابستہ آج بھی ہیں اسی سر زمیں سے ہم

دلی سے پیدائشی، جغرافیائی، نظریاتی اور لسانی تعلق کے باعث تابش دہلوی کی غزلوں میں رنگ و آہنگ اور اسلوب کے لحاظ سے دہلویت کے عناصر بھرپور طور پر نظر آتے ہیں۔ دبستان دلی کے زیر اثر پروان چڑھنے والی غزلوں کی مانند تابش کی غزلیں بھی معنوی تہہ داری، معنی آفرینی، وفور جذبات اور تہذیب افکار کی حامل ہیں اس اعتبار سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تابش کی غزلیں دبستان دہلی کی غزلوں کا ہی ایک شاندار تسلسل ہیں اور یہی چیز تابش کے مقام و مرتبے کی انفرادیت کا سبب ٹھہرتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے دہلویت کی تعریف کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

> تاریخ میں دہلویت نام ہے سلاطین و امراء کے تزک و احتشام کا اور ہند ایرانی تہذیب و ثقافت کی مرکزیت کا۔۔۔ شاعری میں دہلویت کہتے ہیں پاکیزگی کو، جذبے کی صداقت کو، بیان کی صفائی کو، اسلوب کی دلکشی کو، روحانی اقدار کے پاس کو، داخلیت کے انعکاس کو، لفظ و معنی کے باہمی ارتباط کو، دردمندی و انسان دوستی کو میر و میرزا سے لے کر سائل و بیخود دہلوی کی شعری روایات کے احساس کو۔ (۲۶)

دہلویت کے اجزائے ترکیبی کا ذکر کرنے کے بعد وہ تابش کی شاعری اور غزل گوئی کو دہلویت کے

معیار و جلا کے پر پرکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

> یہ ساری چیزیں تابش کی شاعری میں شعوری یا غیر شعوری طور پر بڑی خوب صورتی سے در آئی ہیں اور اسی کی بدولت ان کی شاعری میں تیزی و دل نشینی کی وہ سنجیدہ فضا پیدا ہوئی ہے جس سے ان کے بہت سے ساتھی محروم ہیں۔(۲۷)

دہلوی رنگ و آہنگ کلاسیک اردو غزل کی روح اور پہچان ہے۔ تابش دہلوی کے تمام غزلیہ اشعار اسی روح کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر شکیل نوازش رضا اپنے ایک مضمون میں تابش دہلوی کی غزل گوئی کا جائزہ لیتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

> ان کا انداز بیان دہلوی ہے اور ان کے کلام کی زبان میں بھی دہلوی رنگ اور رچاؤ ان کی غزل کی شناخت بنا ہوا ہے۔(۲۸)

ڈاکٹر نوازش رضا اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی متذکرہ بالا آراء سے اتفاق کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں نظر آتا جب تابش کے درج ذیل اشعار کو سامنے رکھ کر ان آراء کا جائزہ لیا جائے۔

ایک صورت زیبا سے ہیں لاکھ تمنائیں
ایک حسن تصور سے ہے انجمن آرائی

☆☆

روز ہوتا ہے یہاں تابش غروب ایک آفتاب
کوئی داغ آرزو پھر بھی ہمارے دل میں ہے

☆☆

فنا کی منزلوں میں بھی مراحل آئے ہیں کیا کیا
کہیں طوفاں سے گزرے ہیں کہیں ساحل سے گزرے ہیں

☆☆

ہے آمد بہار مسلّم خزاں کے بعد
لیکن رہے گا دور خزاں بھی بہار تک

تابش دہلوی اپنی غزل گوئی اور شاعری میں روایت سے جدائی کبھی مول نہیں لیتے۔ وہ روایت، تہذیب اور راہ بزرگاں سے تمسک میں رہتے ہوئے اپنی شاعری کو تابناک بناتے ہیں اور جدیدیت کو

بھی ساتھ خوش آمدید کہہ کر اپنی غزلوں کو تراوت آمیز اور طربناک بنا لیتے ہیں۔ ان کی غزلیں کلاسیک غزل گوؤں میں میر، میر درد، غالب، سودا کی غزلوں کے رنگ و آہنگ کی بھی حامل ہیں۔ بطور مثال یہاں ان کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ میرؔ کے رنگ میں ان کا ایک شعر یہ ملاحظہ کیجیے۔

میری متاع ، سوز غم دل نہیں رہا
میں روز گار شوق کے قابل نہیں رہا

خواجہ میر دردؔ کے رنگ میں تین شعر یوں ملتے ہیں۔

بند آنکھوں سے دیکھ لی دنیا
ہم نے کیا کیا نہ دیکھ کر دیکھا

☆☆

مزاج زیست کا ایک ایک رخ دکھاتے چلے
ہم اپنی ذات سے سارے حجاب اٹھاتے چلے

☆☆

دانستہ فریب ہم نے کھائے
آسائش جاں بے سود بہانے

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کا رنگ ان اشعار سے مترشح ہے۔

سرگشتہ روح ابھی تک ہے دشت میں
ہر چند وہ سوار وہ محمل نہیں رہا

☆☆

تنک آبی میں بھی ہوتا نہیں ہے تہ کا انداز
کہ دریا پھر بھی دریا ہے اگر پایاب رہتا ہے

تابش دہلوی کی غزلوں میں میرؔ کا سوز و گداز، ملائمت، دھیما پن اور بے ساختگی، غالبؔ کا تخیل بلند اور دردؔ کا صوفیانہ انداز نظر اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ اردو غزل کی کلاسیک روایت سے بڑی مضبوطی سے جڑے ہوئے ہیں۔ تابش دہلوی کی غزل پر سب سے زیادہ اثرات فانی بدیوانی کے ہیں۔ فانی بدایونی کے بعد تابش دہلوی نے میرؔ اور غالبؔ سے زیادہ اثرات قبول کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی

چند ایک غزلیں بھی میرؔ اور غالبؔ کی غزلوں کی زمین میں ملتی ہیں۔

جو حیرانیٔ شوق کم دیکھتے ہیں
انھیں آئینہ دے کے ہم دیکھتے ہیں

☆☆

تاب حسن آفتاب کی سی ہے
بے حجابی حجاب کی سی ہے

☆☆

حسن پنہاں ہے تو پنہاں ہی سہی
ہم ہمہ آئینہ حیراں ہی سہی

میرؔ و غالبؔ سے تابشؔ دہلوی کا جغرافیائی، روایات اور لسانی و ادبی تعلق ہے۔ یہی تعلق تابشؔ دہلوی کو شعوری و غیر شعوری طور پر ان بزرگانِ ادب سے قریب تر کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اپنے ایک شعر میں تابشؔ دہلوی نے میرؔ و مرزاؔ سے اپنے تعلق کو یوں بیان کیا ہے۔

شعر میرے کیوں نہ پہلو دار ہوں تابشؔ کہ میں
ہم وطن ہوں میرزاؔ کا معتقد ہوں میرؔ کا

روایت اور قدیم شاعری سے گہرا ربط و رشتہ قائم رکھنے کے باوجود تابشؔ دہلوی کی غزلوں میں جدیدیت کی طرف میلان اور جدید زمانے کے تقاضوں کی ترجمانی بھی نظر آتی ہے۔ فکر و فن کے لحاظ سے ان کی غزلیں اس سنگم کی مانند ہے جہاں دو تند و سبک سیر دریا آپس میں بڑی خاموشی اور خوش اسلوبی سے مل جاتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے اسی حوالے سے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

> میرا اندازہ ہے کہ اس وقت تابشؔ دہلوی واحد شاعر ہیں جن کی غزل میں دو زمانوں کی ایسا امتزاج اور قدیم و جدید کا ایسا ادغام ہے جو فطری انداز میں عمل میں آیا ہے اور جس کی ابتدا لاشعور کے تخلیقی سرچشموں سے ہوتی ہے۔ (۲۹)

روایت اور جدیدیت کے سنگم میں پنپ کر گیسوئے غزل کو سنوارنے اور غزل کو نئی تخلیقی روح اور نئے ذائقے سے آشنا کرنے کے حوالے سے تابشؔ دہلوی کا اپنا کردار رہا ہے۔ ان کے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں جدیدیت کا ذائقہ اور روایت کا رچاؤ کس خوب صورتی اور سلیقے سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔

ابھی ہیں قرب کے کچھ اور مرحلے باقی
کہ تجھ کو پا کے ہمیں پھر تری تمنا ہے

☆☆

نہ جانے کون کسے کس مقام پر لوٹے
کب ایک دوسرے کا اعتبار راہ میں ہے

☆☆

ربط کیا جسم و جاں سے اٹھتا ہے
پردہ ایک درمیاں سے اٹھتا ہے

ایک غزل گو کی کامیابی کا معیار اور منصب یہ ہے کہ وہ حسن و عشق کے معاملات، باطنی جذبات واحساسات اور سیلِ فکر کو تہذیب وطہارت کی لگام دے کر نظم کرے۔ الفاظ کے انتخاب، جملوں کی بندش اور مضمون بندی تینوں سطحوں پر سطحیت اور حیوانی جذباتیت کو در آنے نہ دے۔ اس لحاظ سے اگر تابش دہلوی کی غزل گوئی کا جائزہ لیا جائے تو وہ یقینی طور پر لائق ستائش اور قابل داد و تحسین ٹھہرتے ہیں۔ ان کے ہاں طہارتِ فکر و خیال اور اظہار میں خلوص نظر آتا ہے۔ محمد عثمان رمز نے اس حوالے سے ایک مقام پر لکھا ہے:

> تابش کی شاعری کی خصوصیت طہارت فکر ہے۔ تابش نے جو کچھ کہا ہو انداز و جہت کے اعتبار سے مثبت ہے اور بدعقیدگی سے پاک۔ اس میں طہارت اور پاکیزگی ہے رجس نہیں۔ (۳۰)

متذکرہ بالا اقتباس پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لیے تابش دہلوی کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

شعورِ جلوہ ہے دشوار چشمِ تر کے لیے
ہزار آنکھ سے روتا ہوں اک نظر کے لیے

☆☆

یہ فراق و وصل و شوق و آرزو کچھ بھی سہی
اک غمِ دل ہی مگر افسانہ در افسانہ ہے

☆☆

آج کچھ اور تقاضائے طلب تھا لیکن
سرِ منزل ہی مجھے شام ہوئی جاتی ہے

☆☆

اک بار تجھے دیکھ کے دیکھا ہے کئی بار
وہ جلوہ ابھی تک جو نگاہوں میں نہیں ہے

محمد عثمان رمز نے تابش دہلوی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے ایک مضمون ''عرفان ذات کا شاعر'' میں کلامِ تابش کی چار خصوصیات ذکر کی ہیں۔ پہلی خصوصیت عرفان ذات، دوسری خصوصیت ''دل'' کو شاعری کا مرکزی مضمون بنانا، تیسری خصوصیت حوصلہ مندی اور چوتھی خوبی طہارتِ فکر ہے۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں کثرتِ طلب کا (Maximisation of Wants) کا روگ موجود ہو، جہاں بد بودار مادیت کا غلبہ ہو، جہاں ہر طرف سے ھل من مزید کی صدائیں بلند ہو رہی ہوں۔۔۔ وہاں ظاہر ہے طلب، خواہشات، مانگ اور جا و بے جا ضروریات کا دباؤ ہر لمحہ بڑھ ہی رہا ہوگا۔۔۔ ایسے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر فرد کو ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہوگی۔ تابش دہلوی کی شاعری میں ہمت اور حوصلے کے محرکات انھی فطری راستوں سے داخلِ وجود ہوئے ہیں۔ (۳۱)

عثمان رمز کی بات میں تابش دہلوی کے درج ذیل اشعار نے وزن پیدا کر دیا ہے۔

بجلیاں گرتی رہیں گی آسماں سے تا بہ کے
پھر گلستاں میں بنائے آشیاں رکھتا ہوں میں

☆☆

ہم کہ گر گر کے سنبھل سکتے ہیں
ابھی کچھ اور بھی چل سکتے ہیں

☆☆

طوفاں کا مقابلہ بھی ہے شرط
گو ہاتھ سے ہاتھ چھٹ گیا ہے

تابش دہلوی غزل میں ہیجانہ جذباتیت کے اظہار کے قائل نہیں۔ حسن و جمال کے باعث باطن قلب میں پیدا ہونے والی ہیجانی کیفیت کو تابش دہلوی تہذیب و تادیب کی ایسی صورت میں پیش کرتے

ہیں کہ عشقیہ اشعار پڑھتے ہوئے بھی قاری کے دل میں حیوانی اور سطحی جذبات نہیں ابھرتے۔وہ عشق کو صرف محبوب تک محدود نہیں رکھتے بلکہ ان کا دائرہ عشق وسعتوں کا حامل ہے۔دائرہ عشق میں وسعت کے باوجود ان کی غزلوں میں لمس وتقبیل اور سطحیت مفقود ہے جو کہ انکی طہارت خیال کی غماز ہے۔مولانا ماہر القادری نے ایک جگہ اسی حوالے سے لکھا ہے:

> تابش کی شاعری میں چھیڑ چھاڑ، لمس وتقبیل اور سطحی اشارے کنائے نہیں ہیں ۔رمزیت واشاریت بے شک ہے مگر وہ سنجیدہ ہے۔یہی باوقار سنجیدگی ان کے کلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔(۳۲)

''دل'' کو تابش دہلوی کی غزلوں میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔شعر دراصل دلی کیفیات اور جذبات کے شائستہ اظہار کا نام ہے۔وہ شعر جس میں قلب اور واردات قلب کو بنیادی حیثیت حاصل نہ ہوتا تو تاثیر وتاثر کی دولت سے محروم رہتا ہے۔تابش کی غزلوں میں دل کو مرکزیت حاصل ہے اور غزلوں کے اکثر وبیشتر اشعار اسی مرکز کے گرد گھومتے ہیں۔یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تابش دہلوی نے ''دل کو انھوں نے اپنی شاعری میں مرکزی مضمون بنادیا ہے۔''(۳۳)

ضبط میں بھی تو سکوں مشکل نظر آیا مجھے
غم کے ہر پہلو میں اپنا دل نظر آیا مجھے

☆☆

جب تمنا غم حیات نہ تھی
دل میں دل کی سی بات نہ تھی

شاعر کے حوصلے کی بلندی اس کے کلام کو بھی بلندی عطا کرتی ہے اور ساتھ ساتھ اپنے قاری کو بھی اس نعمت سے نوازتی ہے۔کلام میں رجائیت دراصل حوصلے کی بلندی اور مثبت انداز نظر سے پیدا ہوتی ہے۔تابش دہلوی کی غزلوں میں قنوطیت نہیں بلکہ رجائیت اور حوصلہ مندی ہے۔وہ گلستاں پر بجلی گرنے کے باوجود آشیاں بنانے، گر کر سنبھل جانے اور ہاتھ سے ہاتھ چھوٹ جانے کے باوجود بھی طوفان کا مقابلہ کرنے کی بات کرتے ہیں۔قنوطیت کی معدومیت اور رجائیت کی موجودگی تابش دہلوی کی غزل گوئی پر چار چاند لگا دیتی ہے۔بطور مثال ان کے درج ذیل شعر ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

بجلیاں گرتی رہیں گی آسماں سے تا بہ کے
پھر گلستاں میں بنائے آشیاں رکھتا ہوں میں

☆☆

کبھی تو پا ہی لیں گے ہم اسے تعبیر کی صورت
جوان بیدار آنکھوں کے لیے بھی خواب رہتا ہے

☆☆

ہم کہ گر گر کے سنبھل سکتے ہیں
ابھی کچھ اور بھی چل سکتے ہیں

تابش دہلوی اپنی تہذیب سے محبت کو کسی شاعر کا سب سے بڑا ورثہ اور اس کی بڑائی کا سبب جانتے ہیں۔ اس تہذیبی ورثے کو فقط عقل کی روشنی ہی میں حاصل نہیں کیا جا سکتا بلکہ تجربات و مشاہدات کی وسعت بھی درکار ہے۔ اس ضمن میں تابش دہلوی اپنے مضمون ''جوان تابش'' میں یوں رقم طراز ہیں:

> اصل میں وہی شاعر بڑا ہے اور تہذیبی ورثہ حاصل کرنے کے لیے عقل کی بزرگی ہی کام نہیں آتی بلکہ سن وسال کا پھیلاؤ بھی ضروری ہوتا ہے۔ (۳۴)

تابش دہلوی کی غزل کو ان کے متذکرہ بالا قول کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تہذیبی دولتِ احساس سے کس قدر مالا مال ہیں۔ ان کی غزلوں میں قدیم تہذیب کی پوری جھلکیاں نظر آتی ہیں جس سے اس بات کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ تابش کے دل و دماغ میں اپنی تہذیب کے لیے کتنی جگہ اور اہمیت ہے۔ ڈاکٹر وقار احمد رضوی تابش دہلوی کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ تہذیبی حوالے سے لیتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

> جناب تابش ایک شاعر ہی نہیں بلکہ تہذیبی انسان ہیں۔ وہ ہماری مشرقی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ تہذیب و شائستگی ان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے جو کچھ تو ان کے ورثے میں ملی ہے اور کچھ تو انھوں نے بزرگوں کی صحبتوں سے حاصل کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری تہذیب و شائستگی کا مرقع ہے۔ (۳۵)

غزل میں دیگر اصناف سخن کی نسبت متنوع موضوعات کو بیان کرنے کی گنجائش ہے اور ہر دور میں غزل اپنے سماج کی پوری عکاسی بھی کرتی چلی آئی ہے۔ تابش دہلوی نے بھی اپنی غزلوں کا دائرہ محدود نہیں رکھا۔ انھوں نے انفرادی اور ذاتی مسائل کو بھی لباس غزل پہنایا اور اجتماعی، سماجی، تہذیبی، سیاسی مسائل کو بیان کرنے کے لیے بھی غزل کا سہارا لیا۔ جدید زمانے میں فرد کی مشکلات کی نوعیت بھی نئی ہے، لوگوں کے رویے بھی نئے ہیں، انداز زیست بھی نیا ہے۔ بے پناہ مصروفیات اور مشکلات کے باعث نئے دور کا انسان "خلوت در انجمن" کی مثال بنا رہتا ہے۔ احساس تنہائی کے گھیرے اور اندھیرے میں اس کی صبحیں اور شامیں کٹتی ہیں۔ نئے زمانے کے انسانوں کی اس پریشانی کی ترجمانی تابش نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ اس شعر میں کی ہے۔

میرے حریف میرے محبّ میرے رشتہ دار
ہے یہ عجیب کوئی نہیں کوئی بھی نہیں

احساس تنہائی کے دلدل میں پھنسنے والے انسان کو تابشؔ دہلوی کی غزلیں حوصلہ و ہمت عطا کرتی ہیں۔ وہ حسرتوں، ناکامیوں اور تنہائیوں کے ہجوم میں بھی راستہ بنا کے چلنے کی بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

قدم قدم پہ تھا ناکام حسرتوں کا ہجوم
اسی ہجوم میں ہم راستہ بنا کے چلے

نئے زمانے کے مشینی دور سے تابشؔ دہلوی کو اس بات کا شدید گلہ ہے کہ اس میں رشتوں کا تقدس برقرار نہیں رہتا۔ تابشؔ دہلوی کہتے ہیں کہ رشتوں کا تقدس مفقود ہو تو پھر آشنا اور نا آشنا میں کوئی تمیز نہیں ہوتی۔

تقدس جب نہ ہو رشتوں کا باقی
تو پھر نا آشنا کیا آشنا کیا

زمانہ بعض اوقات ایسے سوالوں کے جوابات فراہم کرتا ہے جو فلاسفروں، حکیموں اور اہل حل و عقد کے بس میں نہیں ہوتے۔ متعدد اسرار و رموز زمانے کے مرور کے ساتھ خود بخود بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں اسی لیے کہا جاتا ہے کہ زمانہ سب سے بڑا استاد ہے۔ تابشؔ دہلوی کا خیال بھی یہی ہے وہ وقت کے تھپیڑوں سے سبق آموزی کا کام لینے کی بات کرتے ہیں۔

تھپیڑے وقت کے کتنے سبق آموز ہوتے ہیں
زمانہ بھی تو کار سیلیِ استاد کرتا ہے

انسانی سماج میں موجود طبقاتی نظام، نسلی تعصب، معاشی ناہمواری اور انسانوں کے درمیان ایک دوسرے کو راہِ راست سے ہٹانے کے رویے کو شعراء نے اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ تابش دہلوی کے ہاں بھی یہی امور زیرِ بحث آئے ہیں۔ انھیں اس بات کا دکھ ہے کہ انسان ہی انسان کو اس دنیا میں پستی و گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ چناں چہ ایک شعر میں وہ کہتے ہیں۔

کیا تھا خلد میں ابلیس نے آدم کو گمراہ
اب آدم زاد کو گمراہ آدم زاد کرتا ہے

اہلِ اقتدار کا ہمیشہ سے یہ رویہ رہا ہے کہ وہ جن ہاتھوں سے خائف ہوتے ہیں انھیں زنجیروں کا تحفہ فوراً بھیج دیتے ہیں اور جن سے ان کے اقتدار کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو انھیں وہ آزادی کے نام سے آزاد رہنے دیتے ہیں۔ تابش دہلوی ان رویوں کو ظلم کے حربے اور رویے قرار دیتے ہیں اور اہلِ اقتدار و سیاست کی چیرہ دستیوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے یہ شعر قابلِ توجہ ہیں۔

طریقے ظلم کے، صیاد نے سارے بدل ڈالے
جو طائر اڑ نہیں سکتے انھیں آزاد کرتا ہے

☆☆

تابش نہ چھیڑ اہلِ سیاست کا تذکرہ
ان میں لبیب کوئی نہیں کوئی بھی نہیں

معاشرہ اس وقت خوش حال، پرسکون اور باعثِ مسرت ہوسکتا ہے جب انسان آپس میں وفادار ہوں اور ایک دوسرے کی عزت کا پاس رکھیں۔ دوستوں کے درمیان بھی اگر وفاداری کا سلسلہ جاری نہ رہے تو دوستی قائم نہیں رہتی۔ ادب، ادیب اور شاعر کا منصب یہ ہے کہ وہ اپنے سماج کے مسائل و مشکلات کا ادراک کرے اور اہلِ حل وعقد کی توجہ اس طرف مبذول کرائے۔ تابش دہلوی کو ادیبوں اور شاعروں سے یہ گلہ ہے کہ ان کے دل میں ملک و معاشرے اور سماج کا درد نہیں۔ اس لحاظ سے تابش دہلوی ادب میں مقصد کے قائل ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب وہ کراچی آئے تو یہاں بھی اپنے ذوق

خامہ فرسائی کی تسکین شاعری کے ذریعے کرتے رہے۔قیام پاکستان کے بعد پاکستانی معاشرے کی معاشی، سیاسی، سماجی صورت حال کچھ بہتر نہ تھی چناں چہ متعدد شعراء نے ان حالات کو اپنی نظموں اور غزلوں کا موضوع بھی بنایا۔کراچی بھی اس وقت تابش دہلوی کی تعبیر کے مطابق خاک وخوں میں غلطاں تھا۔اس شہر کے حالات کی عکاسی اور ترجمانی اردو شاعری میں بھرپور انداز میں نہیں ہوئی جس کا احساس تابش دہلوی کو شدت سے رہا۔

اس خاک و خوں میں اہلِ کراچی کا درد مند
شاعر ادیب کوئی نہیں کوئی بھی نہیں

فنی اعتبار سے تابش دہلوی کی غزلیں متعدد فنی محاسن کی حامل ہیں۔اہل فن کی صحبت انھیں چوں کہ ابتدائی عمر ہی میں میسر آئی تھی اور ان سے اخذ و استفادہ کرنے کا سلسلہ مشاعروں کے توسط سے ہوا کرتا تھا۔لہٰذا فن کے معائب ومحاسن سے انھیں دقیق آشنائی تھی۔یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں فنی محاسن کی کوئی کمی نہیں۔صنائع و بدائع، الفاظ وتراکیب کی برجستگی اور محاوروں کا استعمال ان کی غزلوں میں چار چاند لگا دیتا ہے۔صنعت تضاد، صنعت رعایت لفظی، صنعت تلمیح، صنعت حسن تعلیل کا فنکارانہ استعمال ان کی غزلوں کی خوبی ہے۔مثلاً ان اشعار میں صنعت تضاد کا استعمال ملاحظہ کیجیے۔

یہ بھی تونگری کی ہے بستی کہ دور تک
مجھ سا غریب کوئی نہیں کوئی بھی نہیں

☆☆

وہ گرم و خشک شام و سحر ہم نہیں بھولے
دلی کی ابھی تک ہے ہمیں آب وہوا یاد

صنعت تلمیح کی مثال کے طور پر یہ شعر قابل توجہ ہے۔

کوئی تو ہوتا جو یہ کوہکن کو سمجھاتا
رواں ہوتی ہے کہیں جوئے شیر تیشے سے

اس شعر میں صنعت حسن تعلیل کا فنکارانہ استعمال ملاحظہ کیجیے:

افق سے دیکھ کر رعنایاں ہم خاک زادوں کی
زمیں بوسی کی کوشش چرخ بے بنیاد کرتا ہے

صنعت رعایت لفظی سے شعر کی لفظی خوب صورتی میں اضافہ اور شعر میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ تابش کے کلام میں یہ صنعت متعدد بار استعمال ہوئی ہے۔ بطور مثال ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

وہ ناخدا جسے دعویٰ ہو ناخدائی کا
سفینہ سیلِ حوادث سے کیوں بچا کے چلے

تابش دہلوی کی لفظیات دراصل شیریں فارسی سے مرکب ہے۔ لفظیات کے لحاظ سے تابش دہلوی کا کلام نہ تو ادق ہے نہ ہی سہل ممتنع کا علمبردار۔ عبداللہ خاور نے اس ضمن میں لکھا ہے:

غزل گوئی کا متوازن آہنگ یہی چاہتا ہے کہ زبان نہ تو فلسفہ و منطق کی ہو نہ بالکل بازاری۔ تابش نے غزل کے مزاج کو سمجھتے ہوئے وہی درمیانی زبان استعمال کی ہے جس سے تغزل نکھرتا ہے۔ (۳۶)

فارسی الفاظ و تراکیب بھی تابش نے اپنی غزلوں میں بہت استعمال کیے ہیں لیکن شعر کی سلاست، روانی اور تفہیم کی راہ میں انھیں کوئی رکاوٹ بننے نہیں دیا اور یہی تابش کی فنی کمال ہے۔ مثال کے طور پر غیرتِ رشکِ وفائے دشمن، حلقۂ گیسوئے دوست، قربِ خرمنِ تمکیں، درمیانِ صبح و شام جیسی تراکیب اپنی طوالت کے باوجود شعر کی شستگی اور روانی پر اثر انداز ہرگز نہیں ہوتی ہیں۔

غیرتِ رشکِ وفائے دشمن کی ہوئی
خالی خالی ہے مرے دل کی طرح پہلوئے دوست
حسن کو اپنے اسیروں کا تماشا چاہیے
دیدۂ مشتاق ہے ہر حلقۂ گیسوئے دوست

☆☆

وہ قربِ خرمنِ تمکیں کسی لہجے کی آنچ
دھیما دھیما شعلۂ آواز یاد آتا رہا

تابش دہلوی کو فارسی زبان پر بھی قدرت حاصل تھی۔ اردو غزلوں میں فارسی کی طویل ترکیبوں کے استعمال کی وجوہات میں سے ایک وجہ شاید فارسی پر انھیں قدرت حاصل ہونا بھی ہو۔ تابش دہلوی کو غزل کی صنف سے بے حد لگاؤ تھا چناں چہ ڈاکٹر محمود الرحمان نے ایک جگہ لکھا ہے۔" غزل تابش دہلوی کی عزیز ترین سے ہے وہ اس صنفِ سخن کی مخالفت بالکل برداشت نہیں کر سکتے۔" (۳۷)

اس کی وجہ تابش دہلوی خود ایک جگہ یوں رقم کرتے ہیں:

> ہماری شاعری کی اعلیٰ ترین صنف غزل ہے اور غزل ہی میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ معاشی، معاشرتی اور سیاسی غرض ان تمام شعبہ ہائے حیات کو جن کا تعلق انسان اور انسان اور کائنات کے رشتوں سے ہے، اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور ان سے پیدا ہونے والے جذبات اور احساسات کو لب اظہار بخشتی ہے۔(۳۸)

یہی وجہ ہے کہ تابش دہلوی تادم حیات ایوان غزل سے وابستہ رہے اور برابر غزلیں لکھتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی غزلوں کے اشعار بقول ان کے دل میں اتر کر پیوستِ رگِ جاں ہونے لگے۔

دل میں اترے اور پیوست رگ جاں ہو گئے
شعر ہیں تابش غزل کے یا کوئی ابروئے دوست

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کی یہ رائے بھی غزلیاتِ تابش کے بارے میں لکھا ہے کہ روایت اور بغاوت دونوں سے بالاتر جاکر اور دونوں کو اپنے مزاج کے موافق ملا کر تابش صاحب نے انفرادیت کا وہ درجہ حاصل کر لیا ہے کہ ان کی شاعری سب سے الگ اور اچھوتی اور منفرد شاعرانہ صفات کی حامل نظر آتی ہے۔ غزل ایک غنائی شاعری ہے۔ غنائی شاعری عام طور پر اور اس میں صنفِ غزل صاف طور پر شاعری کو موسیقی سے قریب ترین لے آئی ہے۔ غزل کا ہر منفرد شاعر ایک نیا راگ جگاتا ہے۔ تابش دہلوی کی غزلیں بھی ایک ایسا نیا راگ سامنے لاتی ہیں جو ان کے فطری جذبات، ان کی تہذیب اور ان کے فنکارانہ شعور کو ملا جلا کر ایک نئی کیفیت پیدا کرتا ہے۔(۳۹)

تابش دہلوی کی غزل گوئی کے اس جائزے کے آخر میں ڈاکٹر شکیل نوازش رضا کی یہ بات یہاں نقل کرنا بے محل اور بے جا نہیں ہوگا جس میں وہ کہتے ہیں:

> تابش دہلوی کی غزل گوئی سے متعلق مختصراً وہی بات کہی جا سکتی ہے جو انھوں نے شاعری کے متعلق کہی ہے۔ یعنی ان کی غزل میں سوز و گداز کے ساتھ ساتھ پاکیزہ اور لطیف جذبات کا اظہار نظر آتا ہے۔ وہ بے معنی تمثیلوں کے ہجوم سے تخیل کو قدم قدم پر صدمہ نہیں پہنچاتے۔ ان کی غزل مسرت سے

دوچار کرتی ہے۔ ان کی غزلوں میں خیال آفرین مناظر میں دل نوازی کے ساتھ ساتھ تازہ کاری ہوتی ہے اور انتشار خیال میں نظم و ضبط کے حصول کا ذریعہ ہے۔(۳۰)

☆☆☆

تابشؔ دہلوی کی نظمیں

(مختصر جائزہ)

تابشؔ دہلوی کی نظموں کے مجموعے ''غبارِ انجم'' طبع ۱۹۸۴ء میں ۲۹ نظمیں ۱۴، ملی نظمیں ۱۴، نظمیں شخصیات (ذاتیات) پر لکھی ہوئی، ایک قصیدہ غالبؔ پر، اسی قصیدے سے متصل ایک غزل اور ایک ہائیکو شامل ہے جبکہ ۳ ملی نوعیت کی نظمیں ''دھوپ چھاؤں'' طبع ۱۹۹۶ء میں بھی شامل ہیں۔ مجموعہ کلام ''غبارِ انجم'' میں شامل نظم ''خلد بازیافتہ'' ذرا سی ترمیم کے ساتھ کتاب ''دھوپ چھاؤں'' میں بھی شامل کی گئی ہے۔ یوں مجموعی طور پر کل نظموں کی تعداد (نعت اور حمد کے علاوہ) ۶۰ نظمیں بنتی ہے۔ ان ۶۰ منظومات میں سے بھی اگر شخصیات اور ذاتیات پر لکھی نظموں کو الگ کر کے دیکھا جائے تو نظموں (بطور صنفِ سخن) کی تعداد محض ۲۹ بنتی ہے۔ کمیت کے اعتبار دیکھا جائے تو تابشؔ دہلوی کی نعتوں کی تعداد ''تقدیس'' میں ۳۰ ''دھوپ چھاؤں'' میں ۲۹ بنتی ہے۔ یوں کل نعتیں ۵۹ بنتی ہیں جبکہ غزلوں کی کل تعداد ۶۳۹ بنتی ہے۔ اس گنتی کے پیشِ نظر یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ تابشؔ دہلوی بنیادی طور پر میدانِ غزل کے شہسوار ہیں۔ یہاں یہ غلط فہمی کسی قاری کو نہیں ہونی چاہیے کہ تابشؔ دہلوی چوں کہ میدانِ غزل کے شہسوار ہیں تو میدانِ نظم اور نعت و منقبت کی وادیوں میں معمولی درجے کے شاعر ہوں گے۔ تابشؔ دہلوی نے جہاں غزل گوئی میں اپنا منفرد نام و مقام پیدا کیا ہے وہاں ان کی نظم، نعت اور منقبت نے بھی ایک وسیع حلقۂ احباب بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

زیرِ نظر باب میں تابشؔ دہلوی کی محض نظمیں زیرِ بحث ہیں اس لیے ہم اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔ تابشؔ دہلوی کی وہ ۲۹ نظمیں دراصل ان کی نظم کی فنی پختگی کی گواہی دیتی ہیں۔ تابشؔ دہلوی نے ہیئت کے اعتبار سے پابند نظمیں بھی لکھی ہیں اور آزاد نظمیں بھی۔ دونوں طرح کی نظموں میں تابشؔ دہلوی نے اپنے فنکار ہونے کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔

نظم اور غزل میں بنیادی طور پر بڑا فرق ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ غزل کا ہر شاعر اچھی نظم بھی لکھ

سکے۔ اسی طرح یہ بھی کوئی ضروری امر نہیں کہ کامیاب نظم گو غزل بھی ہر صورت میں اچھی ہی لکھے۔ دونوں اصناف سخن کے فنی پیمانے اور تقاضے مختلف ہیں۔ تابش دہلوی نظم اور غزل دونوں کے فنی تقاضوں سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ ان تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں انھوں نے غزل کے میدان میں اپنا لوہا منوایا وہاں میدان نظم میں بھی اپنے اشہب فن کو بڑی کامیابی سے دوڑایا اور داد و تحسین وصول کی۔ اپنی نظموں کے مجموعے "دھوپ چھاؤں" کے مقدمے (حرف آغاز) میں تابش دہلوی نے غزل اور نظم کی شاعری میں موجود بنیادی فرق کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تابش دہلوی کو دونوں اصناف سخن کی فنی باریکیوں کا پورا ادراک تھا۔

> نظم اور غزل کی شاعری میں بنیادی فرق ہے۔ غزل تقلیل لفظی، اختصار، ایجاز اور ابہام کا (اہمال کا نہیں) مطالبہ کرتی ہے۔ بحور اور قافیہ و ردیف کی پابندی اس کے علاوہ ہے۔ برخلاف اس کے نظم تفصیل اور تفسیر چاہتی ہے۔ اس کا ہر گوشہ وضاحت طلب ہوتا ہے۔ نظم بھی غزل کی طرح بحور کی پابند ہوتی ہے۔ (۱)

وقت کے ساتھ ساتھ نظم اور غزل دونوں کے خارجی پیکر کی تنظیم و ترتیب اور موضوع و ہیئت میں تبدیلی آتی رہی ہے۔ غزل کا موضوع محض واردات قلب و نظر اور معاملات حسن و عشق تک محدود نہیں رہا بلکہ معاشرتی، سیاسی، انفرادی، اجتماعی، نفسیاتی ادراکات و مسائل کو اپنے دائرہ اظہار میں بڑی خندہ پیشانی اور فنی رچاؤ کے ساتھ سمو دیا۔ اسی طرح اس کی ہیئت پر بھی تجربے عمل میں آئے۔ غزل نے باطن کے ساتھ ساتھ خارج کی دنیا کو بھی اپنے اندر سمونا شروع کیا۔ نظم کے معاملے میں بھی ایسی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ نظم کے موضوعات کا دائرہ دھیرے دھیرے خارج سے باطن کی جانب پھیلتا گیا۔ اب نظم خارجی مظاہر و مناظر کے ساتھ ساتھ باطنی ادراکات و تحولات و احساسات کو بھی اپنے دامن میں بخوبی سمیٹنے لگی ہے۔ اس کی ہیئت پر کئی تجربے عمل میں آئے ہیں۔ بعض تجربات کو قبولیت حاصل ہو گئی ہے اور بعض ابھی نامقبول ہیں۔

تابش دہلوی نے نظم کے موضوع اور ہیئت میں آنے والی تبدیلیوں کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اسے اپنا بھی لیا۔ ان کی نظمیں موضوع کے اعتبار سے جہاں مظاہر کائنات کی خارجی حقیقتوں کو اپنے دائرہ اظہار میں لاتی ہیں بلکہ خارج سے باطن کی جانب بھی بڑی فنکارانہ صورت میں مائل بہ سفر نظر آتی ہیں۔ پیکر نظم کے فنی و فکری تقاضوں سے تابش دہلوی نہ صرف واقف ہیں بلکہ نظم کے مزاج کے مطابقت رکھنے والی لچک کا بھی خیر مقدم کرتے ہیں۔ تابش دہلوی کے نظمیہ مجموعے "غبار انجم" کا حرف آغاز اس اعتبار

سے ایک خوبصورت تنقیدی اظہار ہے کہ اس میں انھوں نے نظم اور غزل پر پر مغز گفتگو کی ہے۔ یہ گفتگو تابش دہلوی کی نظموں کی فنی اور فکری تفہیم میں بہت معاونت فراہم کرتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> پہلے نظم ترجیع بند، ترکیب بند، مسدس، مخمس اور مثنوی کی شکل میں کہی جاتی تھی۔ جوں جوں زمانہ بدلتا گیا نظم کی ہیئتوں میں بھی تبدیلی آتی گئی اور مغربی ادبی رجحانات کے تصادم سے ہماری نظم کی شاعری نے نئی نئی ہیئتیں قبول کرنی شروع کر دیں اور یہاں تک ہوا کہ قافیہ اور ردیف کی قید ہی نہیں بلکہ بحر کی پابندیوں کو بھی اٹھا دیا گیا اور نظم معرا اور نظم آزاد ہی نہیں بلکہ نثری نظم بھی وجود میں آ گئی۔ یہ بحث الگ ہے کہ "نثری نظم" نظم ہے بھی کہ نہیں؟۔(۲)

تابش دہلوی نظم ہو یا غزل بحر کی پابندی کو لازمی سمجھتے ہیں۔ بحر کی پابندی کے ساتھ ہیئت میں در آنے والی تبدیلیوں اور تجربات کو انھوں نے اپنی نظموں میں عملی طور پر قبول کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہیئت کے اعتبار سے ان کی بعض نظمیں پابند ہیں بعض آزاد نظمیں ہیں اور کچھ نظم معرا ہیں۔ ہیئت کے معاملے میں تابش دہلوی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ تخلیق (نظم، غزل) اپنی ہیئت خود تلاش کرتی ہے۔ کسی بھی تخلیق کا موضوع اپنے لیے مناسب ہیئت خود ہی تلاش کرتا ہے۔ لہٰذا اہم بات یہ دیکھنا ہے کہ کیا شاعر نے موضوع کے مطابق ہیئت کا انتخاب کیا ہے یا نہیں یا موضوع نے اپنے اظہار کے لیے مناسب ہیئت اختیار کی ہے یا نہیں؟۔ اس ضمن میں تابش دہلوی کے اپنے الفاظ ملاحظہ کیجیے۔ وہ لکھتے ہیں:

> غزل اور نظم دونوں کے مضمون اور موضوع اپنی ہیئتیں خود تلاش کرتے ہیں۔ غزل اپنے موضوع کے اعتبار سے بحر، ردیف اور قافیہ کا انتخاب کرتی ہے اور نظم اپنے موضوع کے اعتبار سے اپنی ہیئت خود منتخب کرتی ہے۔ وہ ہیئت پابند نظم کی بھی ہو سکتی ہے اور معرا یا آزاد نظم کی بھی۔ اس لیے ہمارے واسطے یہ ضروری ہے کہ مطالعہ کرتے وقت یہ دیکھیں کہ شاعر نے موضوع کے مطابق ہیئت کا انتخاب کیا ہے یا نہیں یا موضوع نے خود اپنے اظہار کے لیے صحیح اور مناسب ہیئت اختیار کی ہے یا نہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ جو نظمیں اپنے موضوع کے اعتبار سے مناسب ہیئتوں میں کہی گئی ہیں اُن میں تاثیر کا فقدان نہیں ہوگا بلکہ وہ زیادہ پُر اثر اور دلکش ہوں گی۔ اس دعویٰ کی دلیل میں موجودہ مرثیہ کو پیش کیا جا سکتا

ہے۔ جو مرثیہ مسدس کی صورت میں کہا گیا ہے اس میں تاثیر زیادہ ہے برخلاف
اُن مرثیوں کے جو مسدس میں نہیں کہے گئے ہیں۔ (۳)

''غبارِ انجم'' میں تابش دہلوی کی ایک نظم کا عنوان ہے ''ایک جن ایک آدمی'' جو کہ جنگجو اقوام عالم کے نام لکھی ہے۔ یہ نظم بنیادی طور پر طلسم حیات و کائنات اور انسانی قوتِ تسخیر کو موضوع بناتی ہے۔ کائناتی طلسم جو داستانوں میں جنوں پریوں اور ماورائی مخلوقات کے حوالے سے بڑے پرکشش انداز و آہنگ میں بیان کیا جاتا تھا اسے تسخیر کر کے شکست سے دوچار کرنے والا حضرت انسان اپنی تمام تر فہم و دانش و بینش کے باوجود کائناتی حقائق کے سامنے آخر کتنا مجبور و بے بس ہو جاتا ہے۔ نظم ہیئت کے اعتبار سے آزاد نظم ہے۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے اس نظم کے حوالے سے نظم کے نقادوں کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے لکھا ہے:

> اردو میں نظموں میں ہیئت کے تجربوں میں ہمارے ناقدین نے دور کی کوڑی لانے والے شاعروں کی ابہام زدہ، جنسیات آلودہ اور آبرو باختہ نظموں کا مزے لے لے کر ذکر کیا ہے لیکن اس نظم کا حوالہ جس کی یہ مستحق تھی نہیں دیا ہے۔ (۴)

نظم ملاحظہ کیجیے:

سنا ہے یہ پریاں یہ جنات ہیں قاف کے رہنے والے
وہی قاف
جس کی زمیں ہے زمردی، نیلم کے ہفت آسماں ہیں
جہاں کی فضاؤں میں ہیں لعل و مرجان کے طائر پر افشاں
ہوئیں ترنم فروش اور نغمہ برزباں ہیں
بہت دور تک سیم و زر کے پہاڑوں کا اک سلسلہ ہے
بیاباں ہیں کندن کے، پکھراج کی وادیاں ہیں
درختوں میں لگتے ہیں ہر روز زریں خوشے
مے و انگبیں کے بھی چشمے رواں ہیں
کھلا کرتے ہیں پھول دن رات، شاداب چہروں کی صورت
جہاں سرو و شمشاد کی شکل میں نوجواں ہیں
جہاں شہر در شہر بستے ہیں زریں قبا و کمن پہ

بہت خوش جمالوں کی آبادیاں ہیں جہاں
جہاں دشت در دشت نجم و مہ و مہر بکھرے پڑے ہیں
جہاں گوہر ہائے نایاب سیلِ رواں یم بہ یم ہیں
وہاں موت کوئی تصور نہیں شعبۂ زندگی کا
حیاتِ ابد راحتِ جاوداں لمحہ لمحہ مگر
اس طلسم طرب تک پہنچنا کچھ آساں نہیں ہے
بہت دشت دو ردو رمیاں ہیں!!
یہ سارا علاقہ ہے زیرِ نگیں ایک سردار جن کا، اور اک اک قدم پر
ہزاروں طلسم و فسوں پاسباں ہیں!!!
مگر ایک طوطے میں اس جن کی جاں ہے مقید
یہ طوطا ہے موتی محل میں اور اس راستے میں
بہت موت کی گھاٹیاں ہیں بہت کوہ و دریا
مگر آدمی نے تدبر کے ہاتھوں اسے مار ڈالا
کہاں ہیں وہ پریاں وہ جن وہ طلسم و فسوں اب کہاں ہیں؟؟
جنوں سے یہ انساں کتنا بڑا ہے!!!
مگر اس زمیں پر جہاں زندگی ہے کہ بکھری پڑی ہے
ہزاروں طلسمات اک اک قدم پر عیاں ہیں نہاں ہیں
کہیں خردسالی میں تقدیسِ عمرِ ابد ہے
کہیں سال خوردہ زمان و مکاں آفرینش نشاں ہیں
کبھی ہر نظر غرب ماہ مبیں، شرقِ ماہِ منور
کبھی چرخ افکار و عرشِ تصور، یہی قلب و جاں ہیں
خرد کے لیے قطرہ قطرہ ہے نارفتہ طوفاں
جنوں کے لیے پھول ہے ناشگفتہ گلستاں
کبھی اک گلِ نغز فردوسِ راحت ہوا ہے
کبھی حرفِ شیریں میں سو لذتیں دو جہاں کی

کبھی دسترس میں ہیں لاکھوں طلسمی جزیرے
کہیں دور رنگیں خیالات کی بستیاں ہیں
کبھی اک تبسم میں ہیں زعفراں زار نیم شگفتہ
خرابات کی وادیاں اک ترنم سے پیدا
کہیں ایک منظر پہ ہے منحصر حسن جلوہ گری کا
کبھی اک تجلی جہان در جہاں ہے
غرض سارے آفاق کی وسعتیں گم ہیں اس آدمی میں
بہت بے کراں یہ دل وجاں کی پہنائیاں ہیں۔۔۔بہت بیکراں
یہ جن تو نہیں ہے، اسے مار دینا کچھ آساں نہیں ہے
یہاں تک رسائی ہے مشکل، دو عالم یہاں درمیاں ہیں
جنوں سے یہ انساں کتنا بڑا ہے!! یہ کمزور انسان!!

اس نظم کے پہلے حصے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق تاریخ آدم کے اُس دور کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے جب مہم جو خطرات کو دعوت دینے والا اُن سے نبرد آزما اور آخر کار اُن تمام خطرات پر فتح حاصل کرنے والا کردار ہوتا ہے۔ جن مہمات کو وہ سر کرتا ہے اس میں صرف انسانوں سے نہیں جنوں اور جادوگروں سے اُس کا مقابلہ ہوتا ہے اور آخر میں انسان غالب آتا ہے۔ یہ ایک خواب ہے لیکن ان کہانیوں اور داستانوں میں جو صدیوں سے دنیا کی مختلف زبانوں میں نظم اور نثر میں انسانی تہذیب کا ایک عظیم سرمایہ اور انسان کے عزم و حوصلے کا ایک عظیم خواب ہے۔ اسے ان تمام مہمات پر فتح حاصل کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔(۵)

دوسرے بند میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ یہ دنیا طلسمات کی دنیا ہے۔ طلسمات کی دنیا سے زیادہ یہ حقیقی زندگی بذات خود ایک بہت بڑا طلسم ہے۔ اس حقیقی زندگی میں بھی طلسماتی کرشمہ سازی ہے۔ یہ حقیقی طلسماتی دنیا بظاہر کتنی حسین اور پُرسکون معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں انسان اسی زندگی میں اپنے آپ کو کس قدر مجبور اور لاچار پاتا ہے اور جنوں پر غالب آنے والا مدبر اور طلسم شکن انسان بے کسی اور مجبوری میں کتنا چھوٹا اور کمزور نظر آتا ہے۔(۶)

تابش دہلوی کی بعض نظمیں ڈرامائی انداز لیے ہوئے ہیں بطور مثال ان کی نظم "معدلت" ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ بعض میں فلسفیانہ انداز نظر اور طنز کی آمیزش صاف دکھتی ہے۔ اس ضمن میں ان کی نظمیں ان

نظموں کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:۔ وقت، ایک دوست سے، عورت، مسافر، اندھا فقیر، بطور مثال نظم ''وقت'' کے تین شعر ملاحظہ کیجیے:

وقت بقیدِ مکاں باعثِ ذوقِ نمود
وقت بقیدِ زماں رونقِ بزمِ شہود
وقت زمیں کے لیے نقش گرِ روز و شب
وقت سے شمس و قمر جلوۂ چرخِ کبود
وقت کی صورت گری مشعلِ راہِ خرد
وقت کا حسنِ نہاں منزلِ دل کا وجود

نظم ''اندھا فقیر'' اُن لوگوں پر ایک دبی ہوئی طنز پر مشتمل نظم ہے جو لاشعور و لاعلم انسانوں کی فکر اور سوچ کو زیرِ طنز لاتی ہے۔ جو لوگ تہذیب کے نام پر بدتہذیبی کا پرچار کرتے ہیں اور اندھے فقیر کی طرح کائنات کے تہذیبی حقائق و انوار سے ناشناس ہیں۔

ایک اندھا بارِ ہستی سے نڈھال
اپنا پھیلائے ہوئے دستِ سوال
بے نیازِ مرحبا و الاماں
ناشناسِ فکرِ ہر اوج و زوال
ہر قدم پر تنگ میدانِ حیات
فرطِ غم سے سلب پروازِ خیال
ہر نفس میں موت کی سی ہچکیاں
سر سے پا تک ایک مُردے کی مثال
حیف تجھ پر عالمِ تہذیبِ نو
کیا یہی ہے تیرا آغازِ کمال؟

بعض نظموں میں ہندی اثرات نمایاں نظر آتے ہیں مثلاً ''ہولی'' کے زیرِ عنوان لکھی گئی دونوں نظمیں اور ''جیون: تین روپ''۔ بعض نظموں میں غزل کا سا تغزل در آیا ہے مثلاً ''۔۔۔ کو دیکھ کر، بوسہ، ترغیب، ایک چاندنی رات۔

تابش دہلوی نے بعض نظموں میں تغزل کا بھی سہارا ضرور لیا ہے مگر نظم کو غزل بننے نہیں دیا اور یہی ان کا فنکارانہ کمال ہے جو محض ریاضتِ فن سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ ان کی نظم "۔۔۔ کو دیکھ کر" بلحاظ ہیئت مخمس ترکیب بند ہے۔ اس نظم کا بظاہر موضوع، تخلیقِ غزل کا سامان لیے ہوئے ہے۔ دو بند ملاحظہ کیجیے۔

مری نظر میں بھی پرتو ہے شعلۂ دل کا
تپش سے خاک نہ یہ کشتِ آرزو ہو جائے
مرے نفس میں بھی طوفاں ہے جذبہ دل کا
کہیں تباہ نہ ایوانِ رنگ و بو ہو جائے
مآلِ شوق نہ بن جائے شوق کی تمہید!!

قبول کر کہ مجھے دو جہاں نصیب نہیں
بہائے زیست ہے زخمِ جگر، دلِ پُر درد
قبول کر کہ مہ و کہکشاں نصیب نہیں
متاعِ شوق ہے اک اشکِ گرم و آہِ سرد
نظر نواز تصدق ہے تجھ پہ حسرتِ دید!!

اس مقام پر افضل صدیقی کی اس رائے سے اتفاق کرنے میں کسی طرح کے تامل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

تابش صاحب کی نظمیں بھی ان کی غزلوں کی طرح دل آویز ہیں۔۔۔ ہیئت اور تنوع کے اعتبار سے ہر نظم اپنی جگہ پُر اثر ہے۔(۷)

تابش دہلوی نے خود بھی اپنی نظموں کے حوالے سے اس بات کی امید کا اظہار کیا ہے کہ بحروں اور مختلف ہیئتوں کے تنوع سے ان کی تاثیر میں اضافہ ہوگا۔ "غبارِ انجم" کے حرفِ آغاز میں لکھا ہے۔

میری ان نظموں میں پابند نظمیں بھی ہیں، معرا اور آزاد نظمیں بھی اور بعض میں ہندی بحریں بھی استعمال کی گئی ہیں۔ امید ہے، بحروں اور مختلف ہیئتوں کے تنوع سے شاید یہ نظمیں زیادہ پر تاثیر ہوں اور قاری پر وہی تاثر قائم کریں جو ان کو کہتے وقت میرا تھا۔(۸)

☆☆☆

تابش دہلوی کی مذہبی شاعری

تابش دہلوی کی نعتیں: ایک جائزہ

کمیت کے اعتبار دیکھا جائے تو تابش دہلوی نے دو حمد یں لکھی ہیں۔ نعتوں کی تعداد "تقدیس" میں ۳۰ اور "دھوپ چھاؤں" میں ۲۹ بنتی ہے۔ یوں کل نعتیں ۵۹ بنتی ہیں جبکہ ان کے مجموعہ کلام "دھوپ چھاؤں" میں ۱۰ اسلام اور منقبتیں شامل ہیں۔ "تقدیس" میں ۹ سلام، ۴ منقبتیں اور ایک مرثیہ شامل ہے۔ تابش دہلوی کی مذہبی شاعری بھی فکر وفن کے اعتبار سے کسی بھی طور پر نہ صرف کمتر نہیں بلکہ لائق تحسین و قابلِ ستائش ہیں۔

ہر صنفِ سخن کے موضوع اور اس سے متعلق مضامین و خیالات اپنے اظہار و ابلاغ کے تقاضے الگ ہوتے ہیں۔ غزل کے انداز اظہار اور نظم کے اسلوب بیان میں نیز نعت، حمد اور منقبت کے اسلوبِ اظہار میں فرق ہوتا ہے۔ دراصل اسلوب بیان ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے مختلف اصناف کو ایک دوسرے سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ تابش دہلوی شاعری میں اسلوب کی اہمیت کا بھرپور ادراک و علم رکھتے تھے۔ اپنے مضمون "سچی شاعری" میں اس ضمن میں بڑے واضح الفاظ میں انھوں نے اس حوالے سے اپنا نقطہ نظر بیان کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> شعری تخلیقات میں صرف موضوع ہی اہم نہیں ہوتا بلکہ موضوع کا برتنا بھی اہمیت رکھتا ہے اور اسی کو شاعر کا اسلوب کہتے ہیں۔ یہ اسلوب شاعر کی ذاتی قوتِ فکر، تخلیقی ندرت اور فنی مہارت سے حاصل ہوتا ہے اور اسلوب ہی کسی تخلیق کو ادنیٰ و اعلیٰ، عارضی و دائمی یا صحافیانہ اور ادبی مقام پر فائز کرتا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ موضوعات غیر اہم ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بعض موضوع اہم، بعض غیر اہم اور بعض اہم تر ہوتے ہیں لیکن شاعری میں ان کا انحصار فنی دلکشی اور

اسلوبِ اظہار ہی پر ہوتا ہے۔(۱۰)

مذہبی شاعری اپنے موضوعات اور اسالیب دونوں کے اعتبار سے اس لیے مشکل ہے کہ اس میں عقائد و احترام کی حدود و قیود کا پاس و لحاظ رکھنے میں اگر کوئی کمی بیشی ہو جائے تو شاعر کو دنیا اور آخرت دونوں میں ہزیمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔محمد ذاکر علی خاں کے نعتیہ مجموعے "رختِ سفر" پر تابش دہلوی کے لکھے ہوئے مضمون میں نعت کی تاریخ پر عربی و فارسی ادب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اس کے موضوع و اسلوب کی نزاکت کے حوالے سے لکھا ہے:

> نعت کا موضوع بظاہر نہایت مختصر نظر آتا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ موضوع نہایت وسیع اور مشکل موضوع ہے۔وسیع اس لحاظ سے ہے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کی ذات و صفات کے حوالے سے ہمارے تمام تہذیبی، ثقافتی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی پہلو آ جاتے ہیں اور مشکل اس لحاظ سے ہے کہ عقیدۂ توحید کی حدود میں رہ کر رسولؐ کی ذات و صفات کا احاطہ کرنا اور احترامات رسول کو انسانی رشتوں کے حوالوں سے ملحوظ رکھنا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔(۱۱)

تابش دہلوی کا تخلیقی جوہر غزل نظم اور نعت تینوں اصناف میں کھلا ہے۔ان تینوں اصنافِ سخن کو ان کی تاریخ آغاز و ارتقا کے علم سمیت تابش دہلوی نے شعوری طور پر اپنایا ہے۔محمد ذاکر علی خاں کے مجموعۂ نعت "رختِ سفر" پر لکھے گئے ان کے مضمون میں نعت کے لغوی و اصطلاحی معنی کی تفصیل، عربی و فارسی ادب میں نعت کے آغاز و ارتقا، اردو میں نعت نگاری کی روایت اور اس کا فارسی نعت گوئی کی روایت سے تقابل نیز اس ضمن میں الفاظ کے دروبست پر کی گئی بحث سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ تابش دہلوی نعت اور اس کے فن و ارتقا سے خوب آشنائی رکھتے تھے۔ایک اقتباس اس مدعا کی دلیل کے طور پر ملاحظہ کیجیے۔

> عربی لغت میں نعت کے معنی ہیں اچھی اور قابلِ ستائش صفات کا کسی شخص میں پایا جانا۔۔۔فارسی میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔۔۔اب فارسی اور اردو میں نعت کی اصطلاح صرف اور صرف رسول اکرمؐ کی مدح اور توصیف کے لیے مخصوص ہے۔نعت کی اصطلاح کسی ہیئت سے مخصوص و منسوب نہیں بلکہ اس سے مراد صرف موضوع ہے۔نعت تو قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مسدس

غرض ہر ہیئت میں یہاں تک کہ نثر میں بھی کہی جا سکتی ہے۔۔۔عربی میں نعت
کے اشعار بعثت کے آغاز ہی سے ملتے ہیں۔ حضرت ابو طالبؑ کے نعتیہ اشعار
غالباً عربی کی پہلی نعت ہیں۔ بعض نعتیہ اشعار حضرت عائشہؓ سے بھی منسوب
ہیں۔۔۔فارسی میں نعت گوئی کی ابتدا بہت بعد کو ہوئی اور پھر ایسی نعتیہ شاعری
ہوئی کہ ادب کا دامن نعت کے اشعار سے بھر گیا۔ان شعرا میں ابوالفرج
رونی، اوحد الدین انوری، سعدی شیرازی، مولانا روم، عبد الرحمن جامی، عرفی
شیرازی، اور قاآنی غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں۔ اردو کے نعت گو شعرا میں غلام
امام شہید، کرامت علی خاں شہیدی، امیر مینائی، محسن کاکوروی، شاہ نیاز
بریلوی، احمد رضا خان، حسن رضا خان، حالی، ظفر علی خان، بیدم وارثی، علامہ
اقبال، ویرام کوثری، حفیظ جالندھری، سہیل عظیم آبادی، مولانا ضیاء
القادری، ماہر القادری، عبد العزیز خالد، حافظ لدھیانوی، اعظم چشتی، عبد الکریم
ثمر اور حفیظ تائب قابل ذکر ہیں۔ فارسی اور اردو کے نعت گوئی کے ابتدائی دور
کے شعراء نے صرف رسول مقبولؐ کے حلیہ، واقعہ معراج اور معجزات ہی سے اپنی
نعتوں کا مواد حاصل کیا۔۔۔اور اب اخلاقِ نبویؐ اور صفاتِ نبویؐ کا بیان بھی
ہونے لگا اور اس بیان میں رسول اللہؐ کے روز مرہ معمولات یعنی آپؐ کے حسن
عمل، حسنِ خلق، حسن معاملت، عدل و انصاف، شفقت و رأفت غرض حضور کی
زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو نعت کا موضوع نہ بنا ہو۔(۱۲)

تابش دہلوی نے اپنی حمد، نعت، منقبت اور مرثیہ چاروں اصناف میں موضوع اور اسلوب کے اعتبار
سے جتنی احتیاط برتی ہے وہ اُن کے اسی فکر و احساس کی دین ہے۔ تابش دہلوی نے اس اعتبار سے اپنی مذہبی
شاعری میں جہاں تہذیبِ فکر و اظہار کا پاس و لحاظ رکھا ہے وہاں تہذیبِ نظر اور ضبطِ نظر کا بھی التزام کیا ہے۔

خلدِ نظارہ ہے طیبہ ، احتیاطِ اہلِ نظر
ہر نظر کے ساتھ تہذیبِ نظر بھی چاہیے
باادب ذوقِ حضوری ، ہشیار اے جذبِ شوق
پیش گاہِ مصطفیٰؐ ضبطِ نظر بھی چاہیے

تابش دہلوی حضورؐ سے وابستگی اور ان کے نقش قدم پر چلنے کو نجات و رفعت کا عظیم ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے عقیدت کا اظہار اور جذبے کی شدت درج ذیل اشعار میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

محورِ ہستی فقط ذاتِ رسولؐ
دین و دنیا مصطفیٰؐ تا مصطفیٰؐ

تابش ایماں ہے مرا قرآن پر
اور قرآن سراپا مصطفیٰؐ

☆☆

مبتلا عشق نبیؐ میں ہو کر
صحبتِ فکر ہوا کرتا ہوں

☆☆

یہ دین بھی تجھ سے ہے یہ دنیا بھی تجھی سے
تجھ سے نہ تعلق ہو تو دنیا ہے نہ دیں ہے

جو محمدؐ کے آستاں سے ملا
وہ کہاں ہم کو دو جہاں سے ملا

☆☆

نبی کے باب میں پابند ہوں حکم شریعت کا
مگر پھر بھی تقاضا اور ہی کچھ ہے محبت کا

☆☆

ملحوظ رہی حدِ ادب بابِ نبیؐ پر
نظریں نہ گئیں دیدۂ نمناک سے آگے

☆☆

دامنِ کائنات کم پایا
اس قدر اُن کے آستاں سے ملا

☆☆

فضائے نور میں ہو جائے منتشر یہ وجود
دیارِ طیبہ میں یہ خاک کُو بہ کُو ہو جائے

☆☆

اُس ایک لمحہ کا عمرِ ابد بھی صدقہ تھی
درِ رسولؐ پہ جو لمحہ میں گزار آیا

☆☆

بفیضِ صاحبِ معراج تابشؔ
جہاں ، صورت پذیرِ ارتقا ہے

☆☆

محمدؐ دین بھی میرا ، محمدؐ میری دنیا بھی
عقیدت کا یہی مسلک ضرورت کا یہی رشتہ

☆☆

احد نہیں احمد ہیں کیا ؟ یہ کیا معلوم
حجابِ میم یہاں کب کسی سے اٹھا ہے
حجابِ عقل تو لاکھوں اٹھائے اہلِ دانش نے
کسی سے آج تک لیکن نہ پردہ میم کا اٹھا

☆☆

پیرہن میرا غبارِ رہِ طیبہ ٹھہرا !!
میری عزت مری زینت اسی پوشاک سے ہے

☆☆

مبارک ہو سرکارِ طیبہ سے تابشؔ
تجھے نعت گوئی کی خدمت ملی ہے

☆☆

سخنورانِ زمانہ کی عاقبت معلوم
اگر متاعِ سخن نعتِ مصطفیٰؐ بھی نہیں

☆☆

سُوئے طیبہ چلا ہوں نعت بلب
کس قدر سرخوشی میں آیا ہوں

☆☆

بحرِ ذخار ایک موجِ کرم
ہمہ تن تشنگی میں آیا ہوں

تابش دہلوی کی نعت کے ظاہری محاسن کے حوالے سے لطافت طلبی، دریا لقبی، سیراب لبی، پستی کو مذاقِ برتری، وہم کی دیوار میں در، عفتِ مریم کا آئینہ، غازہ رخی گردِ سفر، شرفِ اجتبائی، دلدارِ خستگاں، مصدرِ خیر، گردشِ انوار، پردۂ اسرارِ خرد اور حیرتِ چشمِ کلیم جیسی تراکیب و لفظیات کی مثالیں پیش کرنے کے بعد محمد عثمان رمز نے لکھا ہے:

میرے احساسات یہ ہیں کہ عقیدے کی صحت، مقامِ رسالت کی پہچان، کارِ نبوت کی تفہیم اور مدحتِ نبیؐ کے لیے جناب تابش نے صنفِ نعت گوئی کو نئی لفظیات کا ایک ضروری ذخیرہ، نئی ڈکشن کی ایک نئی پونجی اور نئی تراکیب کا ایک نیا سرمایہ دیا ہے۔(۱۳)

فنی اعتبار سے تابش دہلوی کی نعتیں غزل کے قریب تر ہیں۔ ہیئت، شدت و وفورِ جذبات اور گرمیِ اظہار و بیان تینوں لحاظ سے بطورِ عموم تابش دہلوی کی نعتیں غزل سے قریب نظر آتی ہیں۔ ان کی نعتوں کی اسی صفت کی بنا پر قارئین کو اس بات کا تعین کرنا قدرے مشکل ہو جاتا ہے کہ تابش دہلوی کی انفرادیت کا راز ان کی غزل گوئی میں ہے یا ان کی نعت گوئی میں؟ کیوں کہ "کمیت کے اعتبار سے ان کی نعتیں چاہے کم ہی کیوں نہ ہوں، کیفیت کے اعتبار سے ان کا درجہ بہت بلند ہے۔"(۱۴)

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی نے اپنے مضمون "تلاشِ جلوۂ حرفِ سپاس" میں تابش دہلوی کی نعت نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے اس ضمن میں لکھا ہے:

ان کی اکثر نعتیں "غزل پیکر" ہیں۔ غزل جس کا ہر شعر اپنی دنیا آپ ہوتا

ہے، یہی وہ وصف ہے جس کا ارتکاز اور وسعت ہمارے لیے عشقِ رسولؐ کے اظہار کو سہل بنا دیتی ہے۔(۱۵)

متذکرہ بالا حرف مدعا سے متعلق "تقدیس" میں شامل ایک نعت کے چند شعر بطور مثال ملاحظہ کیجیے:

مثلِ خورشید وہی بام و سحر سے اٹھے
نور لے کر جو ترے فیضِ نظر سے اٹھے
کیوں گدا تیرا کرے دولتِ دنیا بھی قبول
کیوں یہ احساں بھی ترے دست نگر سے اٹھے
ہاتھ آیا ہے ترا دامنِ رحمت جب سے
کتنے طوفانِ گہر ، دیدۂ تر سے اٹھے
کھا گئی تیرگئی کفر کو صرف ایک کرن
پردے ظلمت کے ، تری ایک نظر سے اٹھے
خلد نظارہ ہے ہر منظرِ طیبہ تابشؔ
نگہِ شوق جو اٹھے تو کدھر سے اٹھے

ایک اور نعت کے چند شعر بھی اسی ضمن میں ملاحظہ کیجیے:

کوئی مثیل ہے نہ بدل ہے حضورؐ کا
سایہ کہاں کہ نور ہی سایہ نور کا
آیا ہے لب پہ اسمِ گرامی حضورؐ کا
ساقی عطا ہو جام شرابِ طہور کا
ان کا نیاز مند ہوں یہ ناز کم نہیں
پایا ہے میرے عجز نے رتبہ غرور کا
تابشؔ انھیں خبر مری بے تابیوں کی ہے
وہ جانتے ہیں حال دلِ ناصبور کا

تابشؔ دہلوی کی بیشتر غزلوں کا پیکر و اسلوبِ اظہار اسی نوعیت کا ہے۔اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی کی مندرجہ ذیل رائے سے اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی جس کے مطابق:

> تابش صاحب کی نعتیہ شاعری کی دوسری فتح تغزل اور لہجہ غزل کو سرکار رسالت پناہ کے مرتبے سے ہم آہنگ بناتا ہے۔ یہ صفت ہمارے کئی ان اچھے نعت گو شاعروں کے ہاں بھی ملتی ہے جو غزل کی صنف میں امتیاز رکھتے ہیں۔(۱۶)

تابش دہلوی کی نعتوں کو ورق ورق پڑھ لیں کہیں بھی کوئی نا ملائم لفظ، ترکیب یا انداز بیاں میں ایسی کوئی کمی کوتاہی نظر نہیں آئے گی جو نعت کے موضوع اور اس کی عظمت کے منافی ہو۔ تغزل آمیز نعت کہنے کے باوجود کہیں پر سطحی الفاظ و انداز اظہار سے تابش دہلوی کی غزلیں مبرا ہیں۔ تابش دہلوی کی تو غزلوں میں بھی سطحیت اور لفظی بے اعتدالی نظر نہیں آتی چہ جائیکہ ان کی نعت میں اس طرح کی کوئی گستاخی سرزد ہو جائے۔

تابش دہلوی نے شعوری طور اپنی نعتوں میں کہیں بھی لفظ ''صنم'' استعمال نہیں کیا ہے۔ اسی طرح بطحا اور یثرب کے الفاظ کے استعمال سے بھی گریز کیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تابش دہلوی شاعری میں بالعموم میں اور مذہبی شاعری میں بالخصوص الفاظ اور لب و لہجے میں حد درجہ احتیاط کے کے قائل تھے۔ اس بات کا اظہار انھوں نے نعیم میرٹھی کی نعتوں اور منقبتوں کے مجموعے پر لکھے ہوئے اپنے مضمون ''سچی شاعری'' میں بھی ان الفاظ میں کیا ہے:

> اردو شاعری میں نعت و منقبت کا سرمایہ خاصا وافر ہے مگر اس سرمایے میں ایک بڑا حصہ افراط و تفریط سے پُر ہے اور شعراء نے نہ صرف افراط و تفریط سے کام لیا ہے بلکہ ان نفوسِ قدسی سے ایسی باتیں منسوب کی ہیں جو نعوذ باللہ شرک کے دائرے میں آتی ہیں۔ نعت ہو، منقبت ہو یا مرثیہ شعرا کو ان اصناف میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔(۱۷)

یثرب و بطحا کے لفظی معنی ''وادیٔ غیر ذی زرع'' یعنی بنجر اور غیر زرخیز زمین کے ہیں۔ ان الفاظ کے لفظی معنی کی وجہ سے تابش نے انھیں اپنی نعتوں میں استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس حوالے سے محمد عثمان رمز کا کہنا ہے:

> جناب تابش نے باتوں باتوں میں مجھے یہ بتایا کہ انھوں نے بطحا اور یثرب کے معنی علی الترتیب ''وادی غیر ذی زرع'' اور بنجر زمین کے ہوتے ہیں۔ تابش دہلوی کی لطیف طبیعت، ان کی خوش فکری اور حقیقت نگاری کے جذبوں کو بھلا یہ بات کیسے گوارا ہو سکتی تھی کہ وہ مدینۃ النبی کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرتے

جن کے معانی میں سقم اور کراہت کے پہلو نکلتے ہوں۔(۱۸)

محمد ذاکر علی خاں کے نعتیہ مجموعے ''رخت سفر'' پر لکھے گئے اپنے مضمون میں تابش دہلوی نے فارسی نعت گو عبدالرحمٰن جامیؔ کی ایک نعت کے مطلع (روحی فداک یا صنمِ ابطحی لقب آشوب ترک، شور عجم، فتنۂ عرب) میں استعمال کردہ لفظ ''صنم'' کے استعمال کو ناپسند کرتے ہوئے لکھا ہے:

ہر چند فارسی میں ''صنم'' کا لفظ محبوب کے معنی میں مستعمل ہے لیکن رسولؐ کے لیے اس کا استعمال ہر لحاظ سے محلِ نظر ہے پھر آشوبِ ترک، شورِ عجم، فتنۂ عرب کہنا کہاں تک درست ہے؟ عربی میں ''فتنہ'' کے معنی کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن فارسی اور اردو میں مروجہ معنی ہی مراد ہوں گے۔(۱۹)

بظاہر امیر خسروؒ سے منسوب ایک فارسی نعت کے تین اشعار ملاحظہ کیجیے جن کی مثال دیتے ہوئے تابش دہلوی نے نعت میں افراط و تفریط کو بشدت ناپسند کیا ہے۔

پری پیکر، نگارے، سرو قدے، لالہ رخسارے
سراپا آفتِ دل بود شب جائیکہ من بُودم
رقیباں گوش بر آواز، او در ناز، من ترساں
سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائیکہ من بُودم
خدا خود میرِ محفل بود اندر لامکاں خسرو
محمدؐ شمع محفل بود شب جائیکہ من بودم

امیر خسروؒ کی اس غزلیہ نعت کی مثال دیتے ہوئے تابش دہلوی نے لکھا ہے:

رسول اللہ کو نعوذ باللہ یا تو کنگھی چوٹی والا معشوق بنا ڈالا یا ان کی توصیف و ثنا کے ڈانڈے شرک سے ملا دیے اور عقیدت مندوں نے بعض عاشقانہ بلکہ بقول مولانا حسرت موہانی ''فاسقانہ'' غزلوں کو نعت کے خانے میں ڈال دیا۔(۲۰)

تابش دہلوی نعت نگاری بطور ''خدمت'' کرتے ہیں اور اس معاملے میں ''تہذیبِ نظر اور ضبطِ نظر'' کے تقاضوں کا بھی بخوبی ادراک رکھتے ہیں۔ ذیل میں بطور مثال پیش کیے گئے اشعار کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تابش دہلوی کی نعتوں میں جذبہ و خیال کے ساتھ ساتھ الفاظ و اسلوبِ ادا کی پاکیزگی، وارفتگی اور صحتِ فکر بھی ان کی شعوری کوششوں کا نتیجہ ہے۔

مبارک ہو سرکارِ طیبہ سے تابش
تجھے نعت گوئی کی خدمت ملی ہے

☆☆

مبارک ہو یہ صحبتِ فکر تابشؔ
کہ ہیں جان و دل جلائے مدینہ

☆☆

سخنورانِ زمانہ کی عاقبت معلوم
اگر متاعِ سخن نعتِ مصطفیؐ بھی نہیں

☆☆

ان کے شایاں ہو ایسا حرفِ سپاس
صرف لوح و قلم نے دیکھا ہے

☆☆

خلد نظارہ ہے طیبہ ، احتیاط اہلِ نظر
ہر نظر کے ساتھ تہذیبِ نظر بھی چاہیے
با ادب ذوقِ حضوری ، ہوشیار اے جذبِ شوق
پیش گاہِ مصطفیؐ ضبطِ نظر بھی چاہیے

غزل اور نظم کو ذریعۂ اظہار بنا کر میدانِ ادب میں شہرت پانے والے تابشؔ دہلوی کی نعتوں کے مطالعے سے یہ احساس ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کلامِ تابشؔ میں زبان کی جو رمز شناسی، الفاظ کے بطون میں پہنچ کر معانی کے گوہر تلاش کرنے کا جو انداز و رجحان ہے، برہنہ گفتاری کی جگہ رمزیت و اشاریت و ایمائیت سے ان کی جو وابستگی ہے، الفاظ و مفاہیم و جذبات کے درمیان وحدت پیدا کرنے کی جو اہلیت و لیاقت ہے، لفظوں کو ہشت پہلو نگینوں کی صورت جوڑنے اور انھیں شمع کی طرح روشن کرنے کی جو قدرت ہے، ان سب کا مقسوم و مقدر یہی تھا کہ یہ سب خوبیاں اور قدرتیں نعتِ سرورِ کونینؐ کے سلسلے میں ان کے کام آئیں۔ تابشؔ کے سفینۂ فن کو آخر ساحلِ محمدی مل گیا۔(۲۱)

تابش کی حمد، مرثیہ اور منقبت کا مختصر جائزہ

تابش دہلوی نے نعت کے ساتھ ساتھ حمد، مرثیہ اور منقبت کے میدان میں طبع آزمائی کی ہے اور بہت خوب طبع آزمائی کی ہے۔ موضوع جو بھی ہو اور جیسا بھی ہو، تابش دہلوی کا فنِ اظہار کہیں بھی پستی کی طرف مائل نظر نہیں آتا۔ الفاظ کے در و بست سے خوب آشنائی، فنِ شعر گوئی پر قدرت اور فکر و خیال کی نظافت و طہارت نے تابش دہلوی کو غزل کیا یوان میں بھی مقام دلوایا، نظم میں بھی قابلِ ستائش ٹھہرے، نعت میں بھی سعادت بھی قابلِ قدر حد تک حاصل ہوئی اور مرثیہ و منقبت کی دنیا میں بھی ان کا فن و بیان لائقِ تحسین ہے۔

حمد، ہو یا نعت، منقبت ہو یا مرثیہ و سلام ان تمام اصنافِ سخن کا تعلق ایک طرف مسلمانوں کے عقائد و نظریات سے ہے تو دوسری طرف ہند اسلامی تہذیب و تمدن اور مذہبی جذبات و احساسات سے۔ غور کیا جائے تو مذہبی شاعری میں مشکلات نسبتاً زیادہ ہیں۔ جہاں فنکار نے اپنے فن کو افراط سے بچائے رکھنا ہے وہاں تفریط بھی قبیح و مذموم شمار کی جاتی ہے۔ گویا افراط و تفریط دونوں سے احساسات کو بچا کر اظہار کا پیرایہ دینا اور پیرایہ بھی ایسا کہ فنی لحاظ سے بے قیمت نہ ہو، بہت مشکل اور ریاضت طلب امر ہے۔

حمد کے سوا باقی مذہبی اصنافِ سخن کے موضوعات اس اعتبار سے بھی زیادہ احتیاط اور فنی ریاضت کا تقاضا رکھتے ہیں کہ ان میں ایک طرف بشری پہلو بھی ملحوظ نظر رکھنا لازم ہے تو دوسری جانب ان ذواتِ گرامی کی معنوی حیثیت و کمالات کو دائرۂ بیان میں لاتے ہوئے شرعی حدود و قیود کی پابندی بھی لازماً کرنی ہوتی ہے۔ بصورتِ دیگر حمد، نعت، مرثیہ، منقبت، سلام میں ذم و قدح کا پہلو تخلیق اور فنکار دونوں کو قعرِ مذلت میں دھکیل دیتا ہے۔ مذہبی شاعری کے حوالے سے تابش دہلوی کو ان تمام امور و مسائل کا پورا ادراک و احساس ہے۔ اپنے مضمون "نئی شاعری" میں لکھا ہے:

> شاعری میں ہجو اور مدح دونوں پیرایۂ اظہار نہایت مشکل ہیں۔ مادح کے لیے لازمی ہے کہ وہ وہی صفات بیان کرے جو فی نفسہٖ ممدوح میں موجود ہوں اور ان کا اطلاق کسی دوسرے شخص پر نہ ہوتا ہو اور اگر ایسا نہ کیا تو مدح پر "مدح بالذم" کا اطلاق ہوگا اور یہی ہاجی (ہجو نگار) کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہجو میں وہی بیان کرے جس کا اطلاق کسی اور پر نہ ہو۔ (۲۲)

تابش دہلوی نے حمد لکھی ہے مگر زیادہ تعداد میں نہیں۔ وہی ایک دو جو عموماً ہر صنفِ سخن کا شاعر بطورِ عقیدت لکھا کرتا ہے۔ تابش کی ایک حمد مجموعۂ غزل "چراغِ صحرا" میں جبکہ ایک "دھوپ چھاؤں" میں

شامل ہے۔ان دونوں میں اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات کی تحمید و تمجید و تحلیل کا جو انداز ہے وہ عام روایتی اسلوب سے قدرے جداگانہ سا ہے۔یوں کہا جا سکتا ہے کہ تابش دہلوی کی حمد بھی دیگر اصناف کی مانند اپنا ایک خاص رنگ و آہنگ رکھتی ہے۔بطور مثال چند شعر دیکھیے:

تیری صفات معطی و مغنی و مقتدر
تیری صفات منذر و قہار و کبریا
تُو عینِ ذات، خلطِ مراتب سے بے نیاز
تیری صفات فرقِ مراتب سے ماورا
تیری نظر میں کافر و دیندار ایک ہیں
اک تُو ہی تو ہے کافر و دیندار کا خدا
عاری تعینات سے ہے اس قدر بسیط
محدود اس قدر کہ دلوں میں سمٹ گیا

☆☆

سب تیری کرشمہ سازیاں ہیں
یہ قطرہ و بحر و مہر و قلزم
ہر دل میں ترا مقام لیکن
آفاق کی وسعتیں تجھے کم

تابش دہلوی نے ایک مکمل مرثیہ اور ایک نامکمل مرثیہ (جس کا محض چہرہ لکھا اور وہ بھی نامکمل) لکھا ہے۔مکمل مرثیے کا عنوان ''آگ'' ہے جبکہ نامکمل مرثیے کے ''چہرے'' میں صرف پانچ بند شامل ہیں۔یہ جو واحد مکمل مرثیہ لکھا ہے اس کی تحریک ڈاکٹر یاور عباس (مرحوم) نے دلائی تھی ( ) کاظمی،سید اقبال حسین،'' تابش دہلوی فروغ علم و ادب اور تہذیب و شائستگی کے لیے ایک تابندہ ادارہ''،مشمولہ:مجلّہ نذر تابش،ص۳۲۳)۔ان کا یہی ایک مرثیہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ تابش دہلوی اگر صنفِ مرثیہ کو اپنی فنی جولانگاہ بناتے تو اس میں بھی بلند مقام پالیتے اور مرثیے کے ذخیرے میں یقیناً اضافہ کرتے۔ان کا مرثیہ ۸۳ بندوں پر مشتمل ہے اور مجموعۂ کلام 'تقدیس'' کے آخر میں شامل کیا گیا ہے۔اس میں مرثیے کی ہیئت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔مرثیے کے عمومی اجزا مثلاً چہرہ،میدانِ جنگ میں آمد،جنگ کا منظر،شہادت،بین،دعا وغیرہ کا خیال رکھتے ہوئے تابش دہلوی نے مرثیہ نگاری کی روایت کو اس دور

میں نئی توانائی فراہم کی ہے۔

مرثیہ اپنے موضوع کے اعتبار سے نعت اور منقبت وحمد کی نسبت زیادہ فنی ولسانی مہارت اور فکری و عقیدتی نظافت کا تقاضا کرتا ہے۔ یہاں ایک طرف جذبۂ غم والم کا بیان مقصود ہوتا ہے تو دوسری طرف عقیدتی ولسانی سطح پر اس بات کا خاص خیال رکھنا لازمی ہوتا ہے کہ امام عالی مقام کی عظیم قربانی اور فلسفۂ شہادت کو اس طرح بیان کرنا ضروری ہے کہ سامعین کے روایتی جذبات کو بھی کوئی ٹھیس نہ پہنچے اور امام عالی مقام کی شان بیان کرنے میں بھی کوئی سہو وخطا سرزد نہ ہو جائے۔

تابش دہلوی کو مرثیے کی تاریخ اور اس کے فنی سفر کے مختلف ادوار و مراحل کا بخوبی علم تھا۔اس کا ثبوت مرثیے کے حوالے سے تابش دہلوی کا لکھا ہوا وہ مضمون ہے جو انھوں نے اثر جلیلی کی مرثیہ نگاری پر لکھا ہے۔اس مضمون کا عنوان ''مرثیہ نگاری میں اثر جلیلی کا مقام'' ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

> مرثیہ وہ نظم ہے جس میں کسی شخص کی موت پر حسرت وغم کا اظہار کیا جائے اور مرنے والے کی خوبیاں اور اوصاف بیان کیے جائیں۔۔۔۔اردو میں عام طور پر مرثیے کا لفظ شہادتِ اہلِ بیت ہی کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے لیکن دراصل مرثیہ صرف واقعاتِ کربلا کے بیان سے مخصوص نہیں ہے۔دوسروں کے مرنے پر بھی جو نظمیں لکھی گئی ہیں ان کو بھی مرثیہ ہی کہتے ہیں لیکن اب اردو شاعری میں مرثیہ سے مراد صرف واقعاتِ کربلا کا بیاں ہے۔۔۔عرب میں واقعۂ کربلا کے متعلق مرثیے شاذ و نادر ہی ہیں۔وہ دور چوں کہ بنی امیہ کا دور تھا اس لیے حکومت کے خوف سے لوگ عام طور پر اپنے اندوہ غم کے جذبات کا اظہار کھلے بندوں نہ کر سکے ہوں گے۔۔۔فارسی شاعری کے آغاز اور عروج کے زمانے میں ملکی انقلاب اور شخصی حادثات کتنے ہی پیش آئے لیکن فارسی میں شہر آشوب اور مرثیے برائے نام ہی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ستائش اور صلے کی کوششیں زیادہ تھیں اور درباروں کی باریابی کو لوگ اپنے لیے زیادہ منفعت بخش سمجھتے تھے۔۔۔۔ایران میں سلاطین صفویہ کے زمانے میں مرثیہ نگاری کا آغاز ہوا۔۔۔اردو میں غالباً سب سے پہلا مرثیہ نگار محمد قلی قطب شاہ ہے لیکن دکن میں سولہویں صدی تک جو مرثیے لکھے گئے انھیں خالص اردو مرثیہ نہیں کہا جا سکتا۔وہ دکنی دور کے مرثیے ہیں۔۔۔دکن کی طرح دلی میں مرثیے نہ لکھے

جانے کا سبب یہ ہے کہ یہاں کے بادشاہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے بادشاہوں کی
طرح شیعی نہیں تھے پھر بھی دلی میں مرثیہ گو شاعر پیدا ہوئے ان میں سب سے
پہلے فضلی ہیں جن کی کربل کتھا یا دہ مجلس مشہور ہے۔۔۔انیس اور دبیر نے مرثیے
کو بام عروج پر پہنچا دیا اور کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جس کو انھوں نے درجۂ کمال
پر پہنچا کر نظم نہ کیا ہو۔" (۲۳)

تابش دہلوی نے اپنے محولہ بالا مضمون میں کئی فارسی، اردو مرثیہ نگاروں پر گفتگو کرتے ہوئے مرثیہ نگاری کے اصول وضوابط بھی اخذ کیے ہیں۔ ان کے نزدیک مرثیہ نگاری کے درج ذیل تین بڑے بڑے اصول ہیں:

۱۔ ممدوح کی عظمت اور شان کا ذکر کرنا تا کہ عبرت حاصل ہو کہ اس پایہ اور مرتبہ کا
شخص دنیا سے اٹھ گیا ہے۔
۲۔ اس کے مرنے سے جو رنج و غم اور ماتم برپا ہوا اس کا ذکر
۳۔ اس کو مخاطب کر کے ایسے خیالات ظاہر کرنا جس سے ظاہر ہو کہ مرنے والے
کی موت کا یقین نہیں بلکہ وہ زندہ ہے۔ (۲۴)

یہاں مرثیے کے ابتدائی حصے سے (جسے رثائی ادب کی اصطلاح میں چہرہ کہا جاتا ہے)، چند بند بطور مثال درج کیے جا رہے ہیں۔ مرثیے کے ان بندوں سے متذکرہ بالا اقتباسات میں کیے گئے دعوؤں کا ثبوت فراہم ہونے کے ساتھ ساتھ تابش دہلوی کی رثائی شاعری پر گرفت کا بخوبی اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ ان میں بالترتیب ذات باری تعالیٰ، رسول معظمؐ اور فاتح خیبرؑ کی توصیف و تعریف کی گئی ہے۔

اس رب ذوالجلال کی مدحت ضرور ہے
جو قادر و قدیر و رحیم و غفور ہے
رب ازل ہے، مالکِ یوم النشور ہے
قبضے میں جس کے عالم غیب و ظہور ہے
معجز نما جہاں میں اُسی کی صفات ہیں
اعیان جس قدر ہیں وہ سب عکسِ ذات ہیں
واحد بھی تو وحید بھی تُو طاق بھی تُو ہی
پروردگار انفس و آفاق بھی تو ہی

مور و ملخ کا رازق و رزاق بھی تو ہی
تو ربِ نور، آگ کا خلاق بھی تو ہی

توقیرِ کعبہ، آبروئے دیر تجھ سے ہے
اے ربِ خیر و شر، یہ شر و خیر تجھ سے ہے

ختمِ رُسل، شفیعِ امم، سید البشر
عیسیٰ نفوس، صاحبِ اعجاز، چارہ گر
خیرِ کثیر، بحرِ سخا، کیمیا نظر
مولا صفت، فرشتہ شمائل، ملک سیَر

سالارِ فوج، صف و منبر کی زین بھی
طائف بھی اس کی راہ میں بدر و حنین بھی

الہام فکر، لہجہ حسیں، گفتگو ادب
طرزِ خطاب، عرف سراج، ہاشمی لقب
مکی نژاد، طیبہ وطن، ہاشمی نسب
محبوبِ بو تراب تو محسودِ بو لہب

دشمن ہے کفر و شرک کا ہر ایک رنگ میں
حق کا رسول ہے حق و باطل کی جنگ میں

کوئی نہیں ہے پیشۂ حق میں علی سا شیر
دستِ قوی ہے جس کے ذرے فلک بھی زیر
جانباز، جاں فروش، دلاور، جری، دلیر
دیں پر حریص، دولتِ دنیا سے چشم سیر

ملنے کے باوجود نہ دنیا قبول کی
اس کی متاع صرف محبت رسولؐ کی

خوش طبع، خوش مزاج، خوش اطوار، خوش سیَر
دستِ قوی میں زورِ ید اللہ سر بسر

قبضے میں ذو الفقار سی شمشیر معتبر
شوہر ہے فاطمہؑ کا تو حسنینؑ کا پدر
کس ایک ذات کو یہ جہاں میں شرف ملا؟
بیٹے کو کربلا ملی ، خود کو نجف ملا

میدانِ کربلا میں عجب سانحہ ہوا
شور الحذر کا نعرۂ ارض و سما ہوا
اک تہلکہ بپا سرِ عرشِ علا ہوا
اعلائے حق کا یہ بھی فریضہ ادا ہوا
خنجر گلے پہ ، خاک پہ ہے سر حسینؑ کا
سجدہ ادا ہوا تہہِ خنجر حسینؑ کا

ڈاکٹر شکیل رضا نوازش نے اپنے مضمون ''تابش دہلوی فکر و فن'' میں تابش دہلوی کے اس واحد مرثیے کو جدید مرثیوں میں ایک اضافہ قرار دیا ہے۔(۲۵)

تابش دہلوی کے اسی مرثیے کے ایک بند کو سید جاوید حسن نے اس دعوے کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ''اگر اس بند کو کسی بھی دبستانِ انیس کے کلاسیکی مرثیے میں خلط ملط کر دیا جائے تو چھانٹنا ممکن نہ ہو گا''(۲۶)

بند ملاحظہ کیجیے:

عباس و قاسم و علی اکبر نہیں رہے
عون و محمد و علی اصغر نہیں رہے
جانِ حسن ، حسین کے دلبر نہیں رہے
اے کربلا وہ تیرے بہتر نہیں رہے
اس وقت دستگیریٔ زینب کو آئے کون
جنگ گاہ سے حسینؑ کا لاشہ اٹھائے کون

مذہبی شاعری تخلیق کرنے کی وجوہات میں عقیدت، حصولِ ثواب، عاقبت گری، ذواتِ مقدسہ کا حصولِ قرب اور مذہبی حس کی تسکین جیسی وجوہات قابلِ ذکر ہیں۔ تابش کا اندازِ بیان نہایت عقیدت مندانہ اور جذبات سے بھرپور ہے۔ تابش دہلوی کے مرثیے ''آگ'' کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بجا طور پر

یہ کہا جا سکتا ہے کہ تابش دہلوی عقیدتی اور جذباتی دونوں سطحوں پر امام عالی مقام اور ان کے باوفا رفقاء کی قربانیوں کے معترف ہیں۔ انھوں نے نعیم میرٹھی کے مجموعۂ کلام پر لکھے گئے مضمون میں امام حسینؑ اور ان کے باوفا اصحاب کی یاد اور ان کی عظیم قربانی کو بار بار دہرانے کو اپنا دینی فریضہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

رسول اکرمؐ سے محبت ہی نے ان نفوس قدسی سے بھی محبت کے رشتے استوار کرائے ہیں جو نبیؐ کی ذات سے وابستگی کی بنا پر خود بھی مقدس و محترم ہیں اور اپنے اتقاء اور دین حق کی کی سربلندی کے لیے اپنی قربانیوں سے ہماری عقیدت واحترام کا محور و مرکز ہیں۔ نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسینؑ اور ان کے رفقا نے دین حق کی سربلندی کے لیے اپنی جانوں کے جو نذرانے پیش کیے وہ یقیناً تاریخ اسلام کا روشن باب ہیں اور ہماری رہبری اور رہنمائی کے لیے منارۂ نور ہیں۔ ان کی مدح وستائش اور ان کے کارناموں کو بار بار دہرانا ہمارا دینی فریضہ ہونا چاہیے۔" (۲۷)

تابش دہلوی کی چار [۴] منقبتیں (خلفائے راشدین میں سے ہر ایک کی ایک ایک منقبت) اور نو [۹] سلام ان کے مجموعۂ کلام "تقدیس" میں جبکہ آٹھ [۸] سلام اور دو [۲] منقبتیں (ایک حضرت علیؑ کی اور ایک امام رضاؑ کی) "دھوپ چھاؤں" میں شامل ہیں۔ یوں کل منقبتوں کی تعداد چھے [۶] اور سلام کی کل تعداد سترہ [۱۷] بنتی ہے۔

آل و اصحاب نبیؐ میں سے جن پر منقبتیں لکھی ہیں ان میں حضرت علی مرتضیٰ، حضرت امام رضاؑ، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ سلام میں حضرت امام حسینؑ اور حضرت عباس علمدارؑ کا ذکر نمایاں ہے۔

مذہبی شاعری کے باب میں تابش دہلوی کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اپنے عقیدے اور عقیدت کو بنیاد بنا کر مذہبی شاعری کی ہے۔ ان کی مذہبی شاعری سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر قائم نہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان کی مذہبی شاعری محض طبع آزمائی کی خاطر کی ہوئی شاعری نہیں بلکہ سلام ہو یا منقبت، مرثیہ ہو یا نعت و حمد بھی میں جذباتی گہرائی، عقیدتی پختگی اور احساساتی وابستگی نظر آتی ہے۔ سید جاوید حسن نے اپنے مضمون "تابش دہلوی" میں چند سلام کے اشعار پیش کرنے کے بعد لکھا ہے کہ تابش دہلوی نے سلام محض طبع آزمائی کے لیے نہیں بلکہ "تہذیب حرمت غم" کی خاطر لکھے ہیں۔ (۲۸)

مناقب وسلام کے چند اشعار طبور نمونہ یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ صحابیٔ رسول حضرت ابو بکر صدیقؓ کی منقبت کا عنوان "حضرت ابو بکر صدیقؓ" ہے۔ اس کے دو شعر ملاحظہ کیجیے:

یہ روز و شب حیاتِ ابو بکرؓ کے رہے
واحد خدا کا سجدہ ، اطاعت رسول کی
ہیں پہلوئے رسول میں بعدِ وصال بھی
صدیقؓ سے نہ چھوٹی رفاقت رسولؐ کی

حضرت عمرؓ پر لکھی ہوئی منقبت کا عنوان "حضرت عمر فاروقؓ" ہے۔ جس کے دو شعر ملاحظہ کیجیے:

منزل منزل فتح و ظفر تھی
مصر عمر کا شام عمر کا
لوحِ جہاں پر ثبت رہے گا
روشن روشن نام عمر کا

حضرت عثمانؓ کی ذات وشخصیت پر لکھی گئی منقبت بعنوان "حضرت عثمان غنیؓ" کے دو شعر:

ایثار کا پیکر ہیں ، وفا کیش و جری ہیں
منجملۂ احبابِ رسولِ عربیؐ ہیں
اسلام کی عظمت پہ ہے قربان زر و مال
خود مال سے بے گانۂ راحت طلبی ہیں

حضرت علی مرتضیٰ کی ذات پُر عظمت پر لکھی گئی ایک منقبت کا عنوان "حضرت علیؓ ابن ابی طالب" ہے اور دوسری کا "منقبت حضرت علیؓ" ہے۔ دونوں سے دو دو شعر ملاحظہ کیجیے:

ایک ایک صفت تابعِ فرمانِ الٰہی
اسلام کا اک نام ہے کردار علیؓ کا
جو حق کے پرستار ہیں ان کے لیے اب بھی
اللہ کا انعام ہے کردار علیؓ کا

☆☆

رسالت تو ہے بنیادِ امامت
سند روشن نبیؐ سے مل گئی ہے

دوگانہ رتبہ ہے تابش علیؑ کا
ولی اللہ ہے احمدؐ کا وصی ہے

غزل، نظم، ہائیکو جیسی اصنافِ سخن کے مقابلے میں فی زمانہ صنفِ سلام و منقبت عمومی طور پر کچھ زیادہ بحث و غور طلب نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں طبع آزمائی عقیدتاً یا محض طبع آزمائی کی خاطر کی جاتی ہے۔ تابش دہلوی نے منقبت و سلام "حرمتِ غم کی تہذیب" اور معرکۂ خیر و شر میں "اظہار و حمایتِ خیر" کے طور پر لکھے ہیں۔ ان کے چند اشعار بطورِ مثال ملاحظہ کیجیے جن سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے اور بقول سید جاوید حسن:

> تابش صاحب کے مندرجہ ذیل اشعار دیکھیے اور فیصلہ کیجیے کہ کیا یہ صرف طبع آزمائی کے لیے لکھے گئے ہیں یا پھر تہذیبِ غم کی حرمت میں۔ (۴۹)

جب سے جانا ہے کہ شبیرؑ سے نسبت ہے اسے
اپنی تہذیب میں ہم حرمتِ غم رکھتے ہیں
بننے دیتے نہیں اک اشک کو بھی خاک کا رزق
یہ سلیقہ غمِ شبیرؑ میں ہم رکھتے ہیں

☆☆

اک تسلسل ہے حق و باطل کا شبیرؑ و یزید
ہے حنین و بدر و خیبر کا اعادہ کربلا
معرکے سارے حق و باطل کے اس کے معرکے
کتنی لامحدود ہے کتنی کشادہ کربلا
ہم انھیں صاحبِ تسلیم و رضا کہتے ہیں
زیرِ خنجر بھی خدا کو جو خدا کہتے ہیں

☆☆

جہاد، اعلائے حق، صبر و رضا، سجدہ، شہادت
مرتب خود بخود ساری شریعت ہو گئی ہے
سجود اور پھر سرِ نوکِ سناں قرآں سرائی
عبادت ہے کہ معراجِ عبادت ہو گئی ہے

☆☆

وفائے حضرتِ عباسؑ کے طفیل اب تک
زمانے والے کچھ اہلِ وفا بھی رکھتے ہیں

☆☆

شکستہ پائی کے باوصف عابدِ بیمارؑ
چلے تو خاک کو خاکِ شفا بنا کے چلے
شعارِ زیست رہا جن کا اسوۂ شبیرؑ
مصافِ حق میں وہ سرباز سر اٹھا کے چلے

☆☆

حسینؑ ابنِ علیؑ معراج والےؐ کے نواسے ہیں
ابھی دشتِ بلا میں تھے ، ابھی کوثر پہ جا نکلے

☆☆

پھر زمانہ اہلِ حق سے بر سرِ پیکار ہے
پھر حسینؑ ابنِ علیؑ، پھر کربلا درکار ہے
لاکھ طوفانی سہی تابش فراتِ زندگی
دامنِ عباسؑ ہاتھ آئے تو بیڑا پار ہے

☆☆

معرکہ اب بھی بپا ، شدت کا ، خیر و شر میں ہے
آج بھی انسان عہدِ کربلا منظر میں ہے
دونوں اوجِ آدمیت پہ ہیں یکساں سربلند
دیکھنے میں فرق کتنا اصغرؑ و اکبرؑ میں ہے

☆☆☆

تابشؔ دہلوی کی مرقع نثر

(بحوالہ: دید باز دید)

تابشؔ دہلوی کی نثر نگاری کا دائرہ اگرچہ ان کے اپنے شعری مجموعوں کی ابتدا میں بعنوان "حرف آغاز" لکھے گئے تمہیدی صفحات، دوستوں کو لکھے گئے خطوط اور شاگردوں کے اشعار کی اصلاح دیتے ہوئے تحریر کیے گئے جملوں تک پھیلا ہوا ہے تاہم یہاں ہم محض ان کی کتاب "دید باز دید" کے حوالے سے ان کی نثر کا جائزہ لیں گے۔ "دید باز دید" تابشؔ دہلوی کی نثر کا باقاعدہ مجموعہ ہے۔ یہ مجموعۂ نثر پہلی بار ۱۹۹۰ء میں اور دوسری بار ۱۹۹۷ء میں چھپا۔ طبع دوم "کل پاکستان حلقہ ادب، کراچی" کی پیشکش ہے۔ اس مجموعۂ نثر کا انتساب تابشؔ دہلوی نے ڈاکٹر مشفق خواجہ کے نام کیا ہے۔ یہ مجموعۂ نثر بھی ڈاکٹر مشفق خواجہ ہی کی تحریک پر اشاعت پذیر ہوا جس کا اظہار تابشؔ دہلوی نے کتاب کے آغاز میں ہی ان الفاظ میں کیا ہے:

> میں نے اپنے نثری مضامین کبھی جمع نہیں کیے۔ نہ معلوم کیوں؟ برادرم مشفق خواجہ نے مجھے اس طرف متوجہ کیا اور یہ کتاب دراصل انھی کی تحریک پر اشاعت پذیر ہو سکی ہے۔(۱)

اس میں ان کے کل ۲۵ مضامین، صہبا لکھنوی کا ایک تعارفی مضمون اور تابشؔ کا ایک ابتدائیہ بعنوان "مبتدا" جو کہ بذات خود ایک مضمون سے کم نہیں، شامل ہے۔

یہ کتاب دراصل بنیادی طور پر تابشؔ دہلوی کے مختلف ادبی شخصیات کے طور اطوار، افکار و خیالات، شعری و ادبی محفلوں کے انداز و معیار سے متعلق یادداشتوں، بعض شعری مجموعوں پر لکھے گئے مضامین اور شاعر، شاعری اور مشاعروں کے حوالے سے لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے بارے میں تابشؔ دہلوی کا اپنا خیال ملاحظہ کیجیے:

> اس کتاب میں بعض شخصیتوں کے قلمی چہرے، تنقیدی مضامین اور چند تبصرے

شامل ہیں۔ بعض مضامین میں سیاق وسباق کے اختلاف کے باوجود بعض
واقعات، بعض نام اور بعض اشعار کی تکرار ہوئی ہے جو ناگزیر تھی۔ ان مضامین
میں بعض ایسے مشاہیر کا تذکرہ ہے جنھیں پرانے لوگ بھول چکے ہیں اور جنھیں نئی
نسل تو جانتی ہی نہیں حالانکہ ان بزرگوں کے نام تہذیب وثقافت ہمیشہ ادب
سے لیں گے۔ نئی نسل کی یہ لاعلمی اور پرانے لوگوں کی یہ "بزرگ
فراموشی" ہمارے تہذیبی ارتقا کے لیے نہایت افسوسناک ہے۔ ہمیں اپنے ماضی
کی تمام عظیم شخصیتوں کو یاد رکھنا چاہیے کیوں کہ یہ شخصیتیں اور ان کے کارنامے
ہماری تاریخ کا ضروری حصہ ہیں۔ (۲)

یہ مجموعۂ نثر اپنے مواد اور معلومات کے اعتبار سے ایک قابل قدر ادبی سرمایے کی حیثیت رکھنے
کے ساتھ ساتھ تابش دہلوی کی نثر نگاری کا انتہائی اہم اور بنیادی ترین حوالہ بھی ہے۔ یہاں ڈاکٹر اسلم
فرخی کے مضمون "نذر تابش" سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں انھوں شاید تابش دہلوی کے سینے میں
پوشیدہ ادبی مناظر و معیار و احوال پر مبنی یادداشتوں کے ایسے ہی کسی مجموعے کی تمنا کا اظہار کیا ہے۔

تابش صاحب قدیم اور جدید ادبی تاریخ کا جیتا جاگتا مرقع ہیں۔ نظم طباطبائی
سے تاجدار عادل تک شاعروں اور ادیبوں کی متعدد نسلوں سے ان کا قریبی رابطہ
رہا مگر تابش صاحب اس رابطے کی ساری داستانیں دل میں لیے بیٹھے
ہیں۔ کھلتے کم ہیں۔ کریدتے اور مسلسل سوال کرتے رہیے تو کچھ تذکرہ کر دیں
گے۔ اگر وہ اپنی یادداشتیں مرتب کر دیں تو ادیب اور ادیبوں دونوں کے بہت
سے نئے پہلو سامنے آئیں گے۔ میں نے بارہا ان سے گزارش کی مگر مشاعرے
انھیں کہاں چھوڑتے ہیں اور وہ خود بھی مشاعروں کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔۔۔ ان
یادداشتوں کو قلمبند نہ کرنا ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ مگر میں یہ بات تابش صاحب کو
سمجھا نہیں سکتا۔ (۳)

ڈاکٹر اسلم فرخی کے متذکرہ بالا اقتباس کو ڈاکٹر شکیل رضا نوازش کے درج ذیل اقتباس سے ملا کر
دیکھا جائے تو "دید باز دید" کی اہمیت و افادیت واضح ہو جاتی ہے۔

تابش دہلوی کا نثری سرمایہ بھی بہت کافی ہے اور وہ گراں قدر بھی ہے۔ انھوں

نے تنقید بھی کی ہے اور خاکے بھی تحریر کیے ہیں۔ساتھ ہی ساتھ ادبی نوعیت کی
یادداشتیں بھی ضبط تحریر میں لائی ہیں۔۔۔ان کی نثری تحریریں تاریخی اہمیت کی
حامل ہیں اور انھوں نے اپنے ہمعصروں پر تنقید وتبصرہ بھی کیا ہے اور ساتھ ہی
اپنے دور کی ادبی تاریخ بھی جستہ جستہ تحریر کردی ہے جو محققین کے لیے فائدہ مند
اور ادبی تاریخ نگاروں کے لیے ان کی حیثیت ایک دستاویز کی سی ہے۔"(۴)

تابش دہلوی کی نثر کا اولین نقش ان کا وہ مضمون ہے جو انھوں نے فانی بدایونی کی رحلت پر "یادِ ایام صحبتِ فانی" کے نام سے لکھا۔ تابش دہلوی نے اسی مضمون کو اپنی نثر نگاری کا آغاز قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

۱۹۴۱ء میں فانی بدایونی کا انتقال ہوا۔ میں نے اپنی زندگی کی پہلی نثر "یادِ ایام
صحبت فانی" کے عنوان سے لکھی اور اس طرح کی ایک محفل میں پڑھی۔ مولانا
سعید اکبرآبادی کو جو ماہنامہ برہان دہلی کے مدیر تھے یہ مضمون پسند آیا۔ انھوں
نے مجھ سے وہ مضمون لے کر ادارتی نوٹ کے ساتھ برہان دہلی میں شائع
کیا گیا۔ یہ مضمون عام طور پر بھی خاصا پسند کیا گیا۔ یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ یہ
مضمون میرا پہلا مضمون تھا۔ اس سے ایک ادبی خوشی یہ میسر آئی کہ مشہور طنز و
مزاح نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک خط میں اس مضمون پر اپنی
پسندیدگی کا اظہار کیا اور مجھ سے فرمائش کی کہ میں علیگڑھ میگزین (علی گڑھ
یونیورسٹی کا مجلّہ) کے فانی نمبر کے لیے ایک مضمون لکھ دوں چناں چہ میں نے
ایک مضمون "فانی کی شاعری میں ان کی زندگی" لکھا جو علی گڑھ میگزین کے فانی
نمبر میں شامل ہے اور اس طرح میری مضمون نگاری کا آغاز ہوا۔"(۵)

تابش کے نثری مجموعے "دید باز دید" میں شامل تمام مضامین کو بنیادی طور پر دو طرح کے ہیں۔ ایک قسم ان مضامین کی ہے جن میں ادبی شخصیات کے خط و خال، حلیہ، وضع قطع، ادیبانہ میل جول، باہمی کشمکش، شعر گوئی اور دیگر شعرا سے مراسم و ملاقات نیز مشاعروں میں دکھائے گئے شعری کمالات، شعر و شاعری سے متعلق ان کے افکار و خیالات وغیرہ بیان کیے گئے ہیں ان کر یہ مضامین عمومی طور پر اسی نوعیت کے ہیں: یادِ ایام صحبت فانی، حضرت جگر مرادآبادی، جوش حیدرآباد میں، یاس یگانہ، منٹو بھائی، میراجی میرا دوست، ماہرالقادری، خواجہ محمد شفیع، صابر دہلوی، کچھ یادیں کچھ باتیں، جب میں حیدر

آباد میں تھا، مشاعروں کی کہانی۔

مضامین کی دوسری قسم میں وہ مضامین شامل ہیں جن میں شعر وشاعری اور کسی شاعر کے فکر وفن پر اظہار خیال کیا گیا ہے یا پھر تنقیدی نوعیت کا تبصرہ کیا گیا ہے۔ تابش دہلوی اگر چہ معروف معنوں میں کوئی ادبی نقاد نہیں لیکن ان کے بعض مضامین ان کی تنقیدی بصیرت کی گواہی دیتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے درج ذیل مضامین قابلِ ذکر ہیں: جواں شاعری، سچی شاعری، اردو شاعری میں ساقی کا کردار، مرثیہ نگاری میں اثر جلیلی کا مقام، صبا اکبرآبادی کی غزل، محمد ذاکر علی خاں کا رختِ سفر، حضرت شہباز امروہوی۔

جن ادبی شخصیات پر مضامین احاطے شامل ہیں ان کو اپنی آسانی کی خاطر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی تعارف، مزاج وحلیہ، شخصیت وکردار وخصوصیات اور شعر وادب وحیات سے متعلق نظریات و خیالات۔ کم وبیش شخصیات پر لکھے گئے تمام مضامین میں ان تین امور پر تابش کی بھی توجہ رہی ہے۔ فانی بدایونی کا حلیہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> دراز قد، چھریرا بدن، سانولا رنگ، کشادہ پیشانی، تیکھے نقوش، پتلی مہری کا پاجامہ، صوفیانہ رنگ کی شیروانی اور نرم ترکی ٹوپی، چہرے پر متانت اور سنجیدگی کے آثار نمایاں، فانی کی شخصیت پُر وقار تھی۔(٦)

فانی بدایونی کے مزاج کے بارے میں لکھا ہے:

> مزاج میں طنز اور مزاح کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ طنز میں کسی کی دل آزاری نہیں کرتے تھے بلکہ اس ڈھب سے طنز کرتے تھے کہ بیک نگاہ آدمی محسوس بھی نہیں کر سکتا تھا اور یہی حال مزاح کا تھا۔(٧)

> فانی نہایت سنجیدہ مزاج تھے لیکن خشک نہیں تھے۔ ان کی شرارتیں بھی ان کی شاعری کی طرح "دقیق" ہوتیں۔ وہ اپنی شرارت سے آدمی کو مخمصے میں ڈال دیتے اور وہ ہنستے ہنستے بچتا۔(٨)

فانی کے خاندانی احوال کے حوالے سے ان کی سہل انگاری اور آرام پسندی کے بارے میں لکھا ہے:

> فانی متوسط کھاتے پیتے گھرانے کے فرد تھے۔ ان کے والد کوتوال تھے اور چھوٹی موٹی زمینداری کے مالک تھے مگر اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے سب کچھ کھو بیٹھے۔ ان کی ناکام زندگی کا سبب ان کی آرام پسندی اور سہل انگاری بھی تھی۔ وہ زندگی

کے مسائل حل کرنے میں بُری طرح ناکام رہے۔ان حالات کے باوجود انھوں نے اپنی وضع اور خودداری کو مجروح ہونے نہیں دیا۔"(۹)

"فانی فطرتاً "جبر کل" کے قائل تھے لیکن آدمی کو کہیں مختار کل اور کہیں مجبور محض مانتے تھے۔وہ دنیا کی ہر چیز کو "حسن" کی طرح قبول کرتے تھے۔ان کی زندگی کی ناکامی کا ایک راز یہ بھی ہے حالانکہ دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جن کو غیر محسوس ہی چھوڑ دینا عقلمندی ہے۔کردار میں خودداری اور شرافتِ نفس کا جذبہ مکمل تھا۔"(۱۰)

فانی شاعری کو فن اور آرٹ کے بجائے فطری چیز سمجھتے تھے۔داغ دہلوی کو ایک غزل ایک بار برائے اصلاح بھیجی تھی۔اس حوالے سے تابش دہلوی کے استفسار پر فانی کا جواب تابش کے لفظوں میں ملاحظہ کیجیے:

میں نے صرف ایک غزل بذریعہ خط اصلاح کے لیے روانہ کی تھی اس کے بعد پھر کوئی اصلاح نہیں لی۔۔۔اس میں شک نہیں کہ شعر کہنے کے لیے مبادیاتِ شعر سے واقفیت نہایت ضروری ہے جو مطالعے سے آسکتی ہے مگر شاعری مطالعے سے نہیں آسکتی۔وہ ودیعت ہوتی ہے اور فطری شاعر کو شاعری سیکھنے کی ضرورت نہیں۔اگر تم اپنی شاعری کو استادی کا محتاج سمجھتے ہو تو ایسی شاعری فوراً چھوڑ دو۔(۱۱)

فانی بدایونی طرحی مشاعروں سے بیزار تھے۔مشاعروں کا ذکر آتا تو بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔تابش نے اس حوالے سے لکھا ہے:

فانی مشاعروں سے ہمیشہ دور رہتے تھے اور اس قدر دور رہتے تھے کہ لوگوں کو ان کے متعلق غلط فہمی ہو گئی تھی۔جب مشاعروں کا ذکر آتا تو ہمیشہ بیزاری کا اظہار کرتے،کہتے تھے کہ یا تو مشاعروں سے طرح کا رواج اٹھا دینا چاہیے یا کم از کم ایک درجن مصرعہ ہائے طرح ہونے چاہئیں تاکہ ہر شخص آزادی سے شعر کہہ سکے۔(۱۲)

بیخود دہلوی کا حلیہ اور وضع قطع تابش دہلوی کے لفظوں میں ملاحظہ کیجیے:

بیخود دہلوی میانہ قد،دوہرے جسم،سانولا رنگ اور کتابی چہرے کے آدمی

تھے۔ چہرے پر بھرواں، کھچڑی داڑھی، سر پر ترکی شیر گولہ ٹوپی، جسم میں کُرتہ اور شیروانی اور سیدھا پاجامہ، ہاتھ میں ہر وقت ہزار دانے کی تسبیح، قلعے میں گوروں کو اردو پڑھاتے تھے۔ (۱۳)

بیخود کی شاعری محاورہ اور زبان کی شاعری تھی (۱۴)

خالص دلّی والوں کا لہجہ، وہی چرب زبانی اور وہی ظلطہ، بات ہوئی اور ضلع جگت پر اتر آئے۔ نمیا محل میں رہتے تھے۔ محلے والے ان سے ڈرتے بھی تھے اور ان کی عزت بھی کرتے تھے۔ (۱۵)

آغا شاعر قزلباش کا حلیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

میانہ قد، سرخ و سفید دوہرے جسم کے آدمی تھے۔ وضع قطع سے بالکل دلّی والے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ کسی زمانے میں نہایت خوبصورت شخصیت کے مالک تھے۔ سر پر پشاوری کلاہ اور پگڑی، جسم پر ترکش کوٹ، ٹانگوں میں اُٹنگی شلوار، پاؤں میں عام طور پر بوٹ اور ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا۔ آواز میں نہایت غمگینی، لیکن وہ مشاعرے میں غزل پڑھتے تو شیر کی طرح گرجتے اور تحت اللفظ ایسا پڑھتے کہ بڑے بڑے مترنم شعرا کی ہوا اُکھڑ جاتی۔ مزاجاً نہایت منکسر اور طبیعت میں ایک فقیرانہ لٹکا۔ (۱۶)

سائل دہلوی رشتے میں داغ دہلوی کے داماد تھے۔ وہ داغ دہلوی کی منہ بولی بیٹی لاڈلی بیگم کے، جو داغ دہلوی کی سالی اولیا بیگم کی نواسی تھی، شوہر تھے۔ لاڈلی بیگم اس سے قبل سائل دہلوی کے چھوٹے بھائی ممتاز الدین احمد خاں مائل کی منکوحہ تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد سائل دہلوی سے ان کی شادی ہو گئی۔ سائل نہایت رکھ رکھاؤ اور باوضع آدمی تھے اور پرانی تہذیب و شائستگی کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ (۱۷)

ان کا حلیہ تابش دہلوی کے لفظوں میں ملاحظہ کیجیے:

دراز قد، سرخ و سفید رنگ، چہرے پر امارت و شرافت خاندانی کے واضح آثار، سفید بھرواں ڈاڑھی، سر پر مخملی چوگوشہ ٹوپی، جسم میں انگرکھا، گفتگو میں نرمی اور شائستگی، آواز میں سُریلا پن، چال ڈھال مہذب، وضع قطع میں ستھرا پن اور

نفاست، گزر بسر خاندانی جائیداد اور لوہارو کے وظیفے پر تھی۔ شہر کے سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ دلی میں ان کے شاگردوں کی کثیر تعداد تھی۔ وہ چنڈت کے کوچے کے قریب لال دروازے میں رہتے تھے۔'' (۱۸)

پنڈت امرناتھ ساحر کا حلیہ اور ناک نقشہ ان الفاظ میں کھینچ لیا ہے:

ڈبلے پتلے، دراز قد اور گندمی رنگ کے مالک تھے۔ چہرہ لمبا تھا، اس پر نہایت لمبی ڈاڑھی اتنی لمبی کہ آخر میں گرہ دینی پڑتی تھی، نہایت مہذب اور اسلامی ہندی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ دلی کی قدیم روایت اور تمدن کے امانتدار تھے۔ (۱۹)

جوش ملیح آبادی کا حلیہ اپنے مضمون ''جوش حیدرآباد دکن میں تھا'' یوں لکھا ہے:

جوش صاحب نہایت خوبصورت آدمی تھے۔ بھرا بھرا جسم، سرخ و سفید رنگت، حسین خط و خال، دراز قد، کشادہ پیشانی، آنکھوں میں غیر معمولی ذہانت، غرض ان کی پرکشش شخصیت ہر آدمی کے لیے جاذبیت رکھتی تھی۔ (۲۰)

نظم کے طرفداروں اور غزل کے علمبرداروں میں ہونے والی باہمی کشمکش کو تابش دہلوی نے جوش ملیح آبادی پر لکھے گئے اپنے مضمون میں ایک جگہ یوں بیان کیا ہے:

فانی ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد آئے۔ ان کے مکان پر بھی روز شام کو ادبی جمگھٹا ہونے لگا۔ ان محفلوں میں جوش، یگانہ، آزاد انصاری، حیرت بدایونی، ماہر القادری، نثار یار جنگ، نواب تراب یار جنگ، سعید علی اختر، صدق جائسی، ہوش بلگرامی وغیرہ شریک ہوتے۔ انھی محفلوں میں غالب کے بام شہرت پر کمندیں ڈالی گئیں۔ انھی محفلوں میں نظیر اکبرآبادی کو عوامی شاعر کہا گیا، (پہلی مرتبہ) اور ان کی شاعری سے ریچھ کا بچہ برامد کیا گیا۔ انھی مجلسوں میں علی اختر اور جوش کی شاعری کے قد ناپے گئے اور نہ جانے کتنے ادبی مورچے لگائے گئے اور تنقید اور تنقیص کے نہ جانے کتنے نشتر توڑے گئے۔ یگانہ کی غالب دشمنی نے یہاں بھی محاذ قائم کیا اور جوش جو غزل کے دشمن تھے اور یگانہ اور کچھ دوسرے حضرات ایک طرف اور فانی، آزاد انصاری، حیرت بدایونی اور ہوش بلگرامی

وغیرہ دوسری طرف ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہو گئے۔ جوش نے
''غزل گو شاعر سے خطاب'' والی نظم فانی پر کہی۔ اسی طرح یگانہ نے بھی کچھ
رباعیاں فانی کے خلاف کہیں اور فانی نے بھی کچھ رباعیاں کہیں۔ (۲۱)

مضمون ''میرا جی میرے دوست'' میں ثناءاللہ ڈار المعروف بہ میرا جی کا حلیہ، چال ڈھال اور وضع قطع ان الفاظ میں تحریر کیا ہے:

میرا جی میانے قد کے آدمی تھے۔ اکہرا بدن، کتابی چہرہ، تیکھے خدوخال، سیدھی
چوڑی پیشانی، گندمی رنگ، چوڑا سینہ، اُبھرواں ستواں ناک، چمکدار گہری
آنکھیں پتلے اور پیوست ہونٹ، دانت خوبصورت اور مضبوط، ہاتھ لمبے اور
چوڑے، شانوں تک بال، مگر ہیئت کذائی یہ کہ ایک ہاتھ میں لوہے کے گولے
دوسرے میں کاغذوں کا پلندہ، گرمیوں میں جسم پر موٹا بدرنگا گرم کوٹ، ٹانگوں
میں میلی گرم پتلون اور پاؤں میں بھدے انگریزی جوتے۔ (۲۲)

میرا جی کی شخصیت اور احساساتی کیفیات کا بیان مندرجہ ذیل اقتباس میں ملاحظہ کیجیے:

ان کی نظر اردو ادب کے ساتھ ساتھ سنسکرت، ہندی اور انگریزی ادب پر بھی
تھی۔ وہ ادبی بحثوں مین کبھی رعب ڈالنے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ پہلے
معقولات سے بحث کرتے اور اگر دوسرا آدمی دو چار کتابوں کا نام لے کر انھیں
مرعوب کرنے کی کوشش کرتا تو وہ ایسے کتابوں کے حوالے دیتے کہ جواب مُسکت
ہوتا۔۔۔۔ اچھا نغمہ سن کر زار و قطار روتے، خوبصورت چہرے ان کی تکلیف میں
اضافے کا سبب ہوتے، اچھا منظر انھیں غمگین کر دیتا غرض احساس کی یہ شدتیں
انھیں سوہانِ روح تھیں۔ انوں نے ان سے فرار کی بہت سی راہیں نکالی تھیں۔ وہ
شراب زیادہ پینے لگے تھے۔ ہر وقت نئی نئی اور عجیب باتیں کر کے وہ اپنا دل
بہلاتے اور توجہ بٹاتے مگر ان سب باتوں میں کوئی بناوٹ نہیں ہوتی تھی۔ وہ سچے
آدمی تھے اور اسی سچائی کو وہ ہر جگہ دیکھنا چاہتے تھے یہ ان کی زیادتی تھی۔ (۲۳)

میرا جی کی ذہنی صعوبت و کیفیت بڑی پُر پیچ تھی۔ ایک طرف شراب و شباب کی رسیا تھے تو دوسری طرف ان کی ذہنی پُر پیچ کیفیت کبھی کبھی یہ روپ بھی دھارتی:

ایک دفعہ قاری زاہر قاسمی کو ایک کمرے میں بند کر کے انھوں نے سورۂ رحمٰن سنی اور پھر روتے روتے اور سر پھوڑتے پھوڑتے ان کا جو حال ہوا اس کا اندازہ ان خراشوں اور چوٹوں سے کیا جا سکتا تھا جو چھے سات دن تک ان کے سر میں اور چہرے پر رہیں۔(۲۴)

شعر کی تخلیق و تحریک سے متعلق میراجی کے خیالات پر درج ذیل اقتباس روشنی ڈالتا ہے:

شاعری ان کی فطرت میں رچی بسی تھی۔ وہ احساسِ حسن کی شدت کو شاعری کا نام دیتے۔ خوبصورت چہرہ، اچھی بات، دلکش نغمہ، دلفریب منظر ان کے نزدیک سب شعر تھے۔ کوئی اچھا چہرہ دیکھا اور انھوں نے نعرہ لگایا "شعر ہو گیا"۔ پوچھنے والوں نے پوچھا: کہاں؟ انھوں نے اشارہ کیا "وہ دیکھو"۔ کوئی پر لطف بات سنی اور انھوں نے کہا شعر ہو گیا۔(۲۵)

حلقہ اربابِ ذوق کے حوالے سے میراجی کو حلقے کا دوسرا نام قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

حلقہ کا دوسرا نام میراجی ہے۔۔۔ میراجی بڑی سرگرمی سے پروگرام بناتے اور لوگوں کو ایک اتوار ہی سے دوسرے اتوار تک یاد دہانی کراتے پھرتے۔۔۔ میراجی اپنی جگہ ایک انجمن میں ہزار انجمن تھے۔(۲۶)

اردو کے معروف ناول نگار، امراؤ جان ادا جیسے شاہکار کے خالق مرزا ہادی رسوا علم نفسیات کے معلم تھے۔ ان کے حلیے اور جائے سکونت کے بارے میں تابش نے لکھا ہے:

مرزا صاحب گداز جسم اور میانہ قد کے آدمی تھے۔ وہ چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی پہنتے تھے۔ پان کی پیک کے دھبے اکثر ان کی شیروانی پر نظر آتے۔ وہ خاصے معمر ہونے کے باوجود زیادہ سے زیادہ پچاس کے معلوم ہوتے۔ مرزا صاحب واجد علی شاہ کے دربار میں رہے تھے۔ مال گزاری کے سامنے پنواڑی کی دکان کے اوپر والے کوٹھے میں رہتے تھے۔(۲۷)

مولوی وحید الدین سلیم اصطلاحات سازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ان کا رہن سہن تابش دہلوی نے یوں لکھا ہے:

مولوی وحید الدین سلیم کا رہن سہن بڑا گندہ تھا۔ گھر کی دیواروں اور فرش پر جگہ

جگہ گندگی اور پان کی پیک کے دھبے، ٹوٹی پھوٹی چارپائیاں چیکٹ بچھونے، غرض ان کے گھر پر ایک طرح کی نحوست برستی تھی۔(۲۸)

ڈپٹی نذیر احمد کے نواسے شاہد احمد، جو شاہد بھائی، مِنّو بھائی، مُنّو بھائی کے ناموں سے پکارے جاتے تھے، انکی وضع قطع تابش دہلوی نے یوں بیان کی ہے:

ان کا لباس ہمیشہ سے ایک خاص نہج کا ہوتا، شفاف بیلدار کُرتہ اور لٹھے کا پاجامہ، اس پر شیروانی اور ٹوپی، پاؤں میں معمولی سا پمپ، وہ ہمیشہ سے بیڑی پیتے اور جب بیڑی نہ ملتی تو سستا سگریٹ پسند کرتے۔(۲۹)

شاہد احمد کے کردار پر خامہ فرسائی ان الفاظ میں کی ہے:

شاہد بھائی ایک خاص مزاج کے آدمی تھے۔ وہ بظاہر کم آمیز تھے مگر بباطن سراپا محبت اور خلوص، ہر شخص سے ایک فاصلہ قائم کر کے ملتے، نہ کسی کی حدوں میں داخل ہوتے اور نہ کسی کو اپنی حدوں میں آنے دیتے، لیکن چند لوگوں سے وہ نہایت بے تکلف اور کُھل کر ملتے۔ مزاج کی اسی کیفیت کی وجہ سے انھیں کچھ لوگ مغرور سمجھتے تھے حالانکہ ان کے مزاج میں بلا کی فروتنی تھی۔۔۔ فروتنی کے ساتھ ساتھ ان میں خودداری بلا کی تھی۔(۳۰)

ماہر القادری کی شخصیت اور کردار کے بارے میں اپنے مضمون "ماہر القادری" میں یوں رقم طراز ہیں:

ماہر القادری یوپی کے ایک متوسط زمین دار گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد بلکہ پورا خاندان نہایت راسخ العقیدہ مسلمان خاندان تھا اور ماہر صاحب کی تربیت میں مذہبی تعلیمات کا ایسا رچاؤ شروع ہی سے رہا کہ آخر تک ان کے مزاج میں اسلام کی پکی لگن اور عشقِ رسولؐ قائم رہا۔ میں نے حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں بھی انھیں ہمیشہ ایک پکا مسلمان پایا حالانکہ جوانی میں عام طور پر لوگ اس ڈگر سے بھٹک جاتے ہیں۔۔۔ وہ بیک وقت ادیب، شاعر، بذلہ سنج، محقق، مولوی، دوست غرض سب کچھ تھے۔۔۔ ان کے پاس بیٹھ کر آدمی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔ ان کی ذات نہایت پہلودار تھی۔ غالباً ۱۹۳۰ء میں ماہر صاحب فلمی دنیا کی سیر کی غرض سے بمبئی چلے گئے اور اس فن میں بھی خاصا

نام کمایا مگر مزاج کو یہ رنگین دنیا پسند نہ آئی۔(۳۱)

تابش دہلوی لکھتے ہیں کہ بیسیوں مشاعروں میں ماہرالقادری کے ساتھ سفر کرنے کا انھیں موقع ملا اور ہر دفعہ ماہرالقادری کے جلد باز مزاج نے کسی نہ کسی لطیفے کو ضرور جنم دیا۔ اپنی دانست میں ماہرالقادری سفر کے تمام لوازمات سے لیس ہو کر نکلتے تھے مگر منزل پر پہنچ کر معلوم ہوتا کہ فلاں فلاں چیزیں رہ گئی ہیں۔

> حیدرآباد سندھ کے ایک مشاعرے میں فاجل ازار بند لانا بھول گئے اور میلے پاجامے کا ازار بند جلد بازی میں اُجلے پاجامے میں ڈالنا چاہا تو وہ ٹوٹ گیا۔ بس پھر نہ پوچھیے کہ کیا عالم گزرا۔(۳۲)

> ماہر کو الفاظ کی تحقیق بلکہ تفتیش کا بڑا شوق تھا اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اس معاملے میں کسی سے رو رعایت نہ برتتے۔ میری ان سے اس معاملے میں اکثر چپقلش رہتی مگر وہ دوستی اور احترام دوستی میں کبھی فرق نہ آنے دیتے۔ ایک دفعہ میں نے کسی محفل مین کہہ دیا کہ فارسی میں تشدید نہیں ہوتی۔ دوسرے ہی دن ایک دس پندرہ صفحوں کا خط میری تردید میں مجھے لکھ مارا، دو چار روز بعد ایک محفل میں مجنوں گورکھ پوری سے ملاقات ہوئی وہاں مولانا بھی تھے۔ میں نے مجنوں صاحب سے اپنی بات کی تائید چاہی، انھوں نے میری تائید کی بس مولانا الجھ پڑے اور کسی طرح یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے کہ فارسی میں تشدید نہیں ہوتی۔(۳۳)

جگر مرادآبادی کے کردار و شخصیت کے بارے میں اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> جگر صاحب نہایت اعلیٰ کردار کے مالک تھے۔ وہ پرانی تہذیبی قدروں کی پاسداری اور حفاظت اپنی میراث کی طرح کرتے اور اسلاف کی ثقافتی نشانیوں کو حرزِ جاں رکھتے، بزرگوں کا ادب، دوستوں کی خاطر مدارات، اہلِ علم و دانش کی خدمت، ناداروں کی دستگیری، ہمعصروں کا احترام، چھوٹوں سے محبت، عیب بینی اور غیبت سے اعراض، غرض انسانی اقدارِ اعلیٰ کا فروغ ان کا وطیرہ تھا اور انھی خوبیوں نے جگر صاحب کی شخصیت کو نہایت دلپذیر بنا دیا تھا۔(۳۴)

جگر مرادآبادی اور جوش ملیح آبادی ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے اور یہ بات سب کو معلوم

تھی۔ جگر کی اعلیٰ ظرفی بیان کرتے ہوئے اس واقعے کو لکھا ہے:

> جگر صاحب کی خوشنودی کے لیے ایک صاحب نے جگر صاحب سے جوش صاحب کے عیب بیان کرنے شروع کر دیے۔ جگر صاحب نہایت خفا ہوئے اور کہا کہ جوش کو میں بُرا کہہ سکتا ہوں آپ ان کے مرتبے کے آدمی نہیں اور یہ حق آپ کو ہرگز نہیں کہ آپ بڑے شاعر کی برائی مجھے خوش کرنے کے لیے کریں۔ (۳۵)

تابش دہلوی کی "دید باز دید" ایک خوبصورت نثری مرقع ہے۔ اس مرقع میں حلیہ نگاری کی بہت خوبصورت اسلوب اور ادیبوں کی ادبی وسماجی زندگی سے متعلق بعض اہم معلومات اس کتاب کی اہمیت کو دوچند کر دیتی ہیں۔ فانی بدایونی پر لکھے گئے ان کے مضامین (فانی کی شاعری میں انبساط، فانی اور ان کا عمومی طرزِ احساس، فانی کی شاعری میں ان کی زندگی) فانی بدایونی کی شاعرانہ فکر وشخصیت کی تعبیر و تفہیم میں تنقیدی وتوضیحی نوعیت کے اہم مضامین ہیں۔ ان مضامین میں اس بات کی تردید کی گئی ہے کہ فانی بدایونی مایوسی اور یاسیت زدہ شاعری کرتے ہیں۔ اس ضمن میں مضمون "فانی کی شاعری میں انبساط" میں لکھا ہے:

> ان کے غمِ محبت کے اجزائے ترکیبی سوز وگداز، ہجر ووصال کی محرومیاں اور نامرادیاں، صبر ورضا، وفا کیشی ووفاداری، شکر وشکایت، سپردگی وجاں سپاری، جبر و اختیار اور احساسِ حسن وعشق ہیں۔ وہ انھی سے اپنی شاعری کا تانا بانا بُنتے ہیں۔ ان کے بعض قاری اور ناقد انھیں قنوطی اور موت کا شاعر کہتے ہیں اور میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟ جبکہ ان کی تمام شاعری ادراکِ غم اور شعورِ غم سے دلوں میں حوصلہ اور جہد کوشی کی تڑپ پیدا کرتی ہے۔ (۳۶)

دوسرے مضمون "فانی اور ان کا عمومی احساس میں اسی حوالے سے مزید لکھا ہے:

> فانی کی ساری شاعری غم سے آسودگی حاصل کرنے کی ایک کوشش ہے۔ جو شخص غم سے خوشی حاصل کرتا ہو میں اسے قنوطی نہیں کہوں گا بلکہ شاید وہی مسرتیں زیادہ مستحکم ہوتی ہیں جن کے حصول کا ذریعہ غم ہو۔۔۔۔ زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا، کا نظریہ جس شخص کا اصولِ حیات ہو اور جو "یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی" کا نعرہ لگا کر زندگی تو زندگی، موت کو بھی اپنی زندگی بنانا چاہتا ہو اسے قنوطی کہنا درست نہیں۔ (۳۷)

خالد علیگ نے اپنے ایک مضمون "تابش دہلوی: ایک فرد ایک ادارہ" میں تابش کی نثری کتاب "دید باز دید" کے حوالے سے جو بات کہی ہے اس سے اتفاق نہ کرنے کی بظاہر کوئی بنیادی وجہ باقی نہیں رہتی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ایک صاحب فکر و نظر اور بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ تابش صاحب ایک بے حد سادہ کار تنقید نگار بھی ہیں۔ شاید انھیں سکہ بند اور تسلیم شدہ نقادانِ ادب و فن کی صف میں تو شمار نہ کیا جا سکے مگر ان کے مضامین اور یادداشتوں کا مجموعہ "دید باز دید" تنقیدی خاکہ نگاری میں ان کے گہرے شعور کی عکاسی ضرور کرتا ہے۔ اس طرح گزشتہ ساٹھ سال کی ادبی و مجلسی زندگی کے بعض ایسے مخصوص افراد، حالات و واقعات اور گوشوں کی نقاب کشائی ہو جاتی ہے جن سے آئندہ کے لیے ادبی تنقید و تحقیق کی راہیں بھی کھل سکتی ہیں۔ دراصل یادداشتوں، مضامین، خاکوں، سوانحی خاکوں اور سفرناموں کا کسی بھی عہد کی عصری کیفیات کے اظہار میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ ان سے ہمیں ایک مخصوص دور میں عوام و خواص کی فکری نہج، ان کی روزمرہ کی زندگی کی ترجیحات و مصروفیات اور معاشرے میں جاری و ساری اُن زیرِ سطح اور بالائے سطح تبدیلیوں اور زیر و بم کا علم و اندازہ ہوتا ہے جو اس مخصوص دور کو اپنے پیشرو ادوار سے ممیز بھی کرتا ہے اور آئندہ کے رجحانات کی نشاندہی بھی۔ اس پہلو سے دیکھیے تو تابش صاحب کی "دید باز دید" نے ایک ایسا بیرومیٹر فراہم کر دیا ہے جس کی مدد سے ہماری آئندہ نسلیں اس پورے عہد میں جھانک سکیں گی جو اگرچہ فی الحال "حال" ہے لیکن امتدادِ زمانہ سے کل اُسے ماضی بن جانا ہے۔ (۳۸)

"دید باز دید" میں شامل مضامین کا انفرادی طور پر موضوع جو بھی ہو اور جیسا بھی ہو تابش دہلوی کا اسلوبِ نثر ان میں سے ہر ایک کا بخوبی ساتھ نبھاتا ہے۔ بات شخصیت نگاری کی ہو رہی ہو یا مشاعروں کی، ادباء کی باہمی کشمکش کی ہو رہی ہو یا کسی سفر کی، کسی کی مرثیہ نگاری زیرِ بحث ہو یا سلام و منقبت نگاری، کسی کی غزل گوئی پر بات کی جا رہی ہو یا نعت گوئی پر، تابش دہلوی کی نثر ایک دھیمے، پُر وقار اور سلجھے ہوئے اسلوب و انداز میں مائل بہ سفر نظر آتی ہے۔ یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تابش کی نثر کے اسلوب

میں بہت لچک ہے۔ اس لچک کے باعث ان کی نثر ہر موضوع کو بخوبی نبھاتی ہے۔ ایک بات جان کی نثر اور شعر دونوں میں اسلوب کے لحاظ سے مشترک ہے اور وہ ہے مہذب اور شائستہ انداز و اطرز بیاں۔ الفاظ کو کسی بھی جگہ اپنی سطح سے گرنے نہیں دیتے خواہ موضوع اور اس کا سیاق و سباق جیسا بھی ہو۔ یہی ان کا کمال ہے۔ سلاست، روانی، ادبیت اور معلومات ان کی کتاب "دیدہ بازدید" کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ تابش دہلوی اگر شاعری نہ بھی کرتے تو ان کا یہ مضامین کا مجموعہ انھیں اردو ادب کی تاریخ میں امر کرنے کے لیے کافی ہوتا۔

تابش دہلوی مشاہیرِ ادب کی نظر میں

تابش دہلوی نے جوش ملیح آبادی پر لکھتے ہوئے اپنے مضمون "جوش حیدرآباد دکن میں" میں لکھا ہے:

> عظیم لوگوں کو ایک نظر دیکھنا بھی عظمت ہے اور مجھے یہ عظمت حاصل ہے کہ میں نے بعض عظیم لوگوں کو قریب سے دیکھا ہے۔ ان عظیم لوگوں میں جوش بھی ہیں۔ (۳۹)

عظیم لوگوں کی صحبت سے تابش دہلوی کو بھی فکری بلندی و پاکیزگی، تہذیبی رکھ رکھاؤ اور پاسداری کا احساس، ادبی سماجی زندگی کے طور اطوار اور فنی کمالات حاصل ہوئے۔ تابش دہلوی کی غزل ہو یا نظم، نعت ہو یا سلام و منقبت و مرثیہ یا نثر سبھی اصناف سخن میں ان کی عظمت اور فنی جوہرو کمالات کا اعتراف ان کے عہد کے بڑے بڑے ادیبوں شاعروں اور اہل فن نے کیا ہے۔ تابش دہلوی کی شخصیت، ان کی فکری پاکیزگی، ان کی فنی ریاضت و بلندی، ان کی خاندانی عظمت، ان کی لسانی مہارت غرضیکہ ان کی ذات، شخصیت اور فکروفن سے متعلق ان کے ہر آشنا و ناآشنا فرد نے تحریری طور پر ان کی عظمت و رفعت و نیکوکاری کا اعتراف کیا ہے۔ یہاں ہم اسی حوالے سے اہم تحریروں سے بعض اقتباسات پیش کریں گے جو متذکرہ بالا دعویٰ کی دلیل ہوں گے۔

ڈاکٹر محمد حسن نے تابش دہلوی کے اولین مجموعۂ غزل پر لکھتے ہوئے اپنے تبصراتی و تنقیدی مضمون میں لکھا ہے:

> حقیقت یہ ہے کہ تابش صاحب کی غزلیں جس کمال کے ساتھ ان کی انفرادیت کی آئینہ دار ہیں وہ اس دور کے کم شاعروں کے حق میں آیا ہے۔ ظاہر ہے وہ ایسی صحبتوں میں اب تک رہے ہیں جن کو ہماری تہذیب کا بہترین نمونہ کہنا چاہیے۔ ان کی شاعری بھی تہذیب یافتہ ادب کی بہترین مثال ہے۔ صحت،

متانت، توازن، نفاست اس کی وہ صفات ہیں جو سب سے پہلے ہمیں متاثر کرتی

ہیں۔ (۴۰)

انجمن ترقی اردو، کراچی کے صدر آفتاب احمد خاں نے تابش دہلوی کو صدارتی تمغۂ امتیاز ملنے پر اپنے ایک تہنیتی مراسلے میں تابش دہلوی کے شاعرانہ مقام اور ان کی غزل گوئی کے بارے میں لکھا ہے:

> جناب تابش دہلوی کا شمار کلاسیکی روایت کے صف اول کے شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کا اصل میدان ہی غزل سرائی ہے۔ غزل گوئی میں اپنا مخصوص، منفرد انداز رکھتے ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے ان کے اشعار عصری حسیت کا بھی پتا دیتے ہیں۔ ان کی غزل گوئی کی عمر اب پچاس سال سے تجاوز کر چکی ہے۔ ان کا شمار آج کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ (۴۱)

اردو سائنس بورڈ لاہور کے ڈائریکٹر جنرل اور معروف شاعر امجد اسلام امجد نے تابش دہلوی کو صدارتی تمغۂ امتیاز ملنے پر نے اپنے تہنیتی مکتوب میں ان کے مقام کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> تابش دہلوی ہماری بزرگ نسل کے ایسے نمائندے ہیں جن کا کلام اور شخصیت دونوں یکساں طور پر خوبصورت اور لائق ستائش ہیں۔ وہ مسلمہ بزرگ ہیں لیکن انھوں نے کبھی اپنی بزرگی کو اپنے اوپر طاری نہیں ہونے دیا۔ وہ خوش طبع، خوش کلام اور خوش خصال انسان ہیں۔ (۴۲)

ادریس صدیقی کے ایک مضمون ''جائزہ'' میں لکھی ہوئی ایک بات کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن نے تابش دہلوی کے ادبی تاریخی مقام سے متعلق لکھا ہے:

> ادریس صدیقی نے جدید دور کے اہم ترین غزلین کا ذکر کر کے تابش صاحب کا رشتہ فانی بدایونی سے جوڑا ہے اور دونوں کے کلام کی مناسبت کو نمایاں کیا ہے۔ تاریخی پس منظر میں تابش صاحب کو یہی مقام دیا جا سکتا ہے۔ (۴۳)

تابش دہلوی کی غزلوں کی قدر و قیمت اور ان کی حقیقت پر ڈاکٹر موصوف نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

> ہمیں ان کی غزلوں میں دوسروں کی پیروی سے زیادہ اُور جنالٹی نے زیادی متاثر کیا ہے۔۔۔ تابش صاحب کی غزلیں بھی ایک ایسا راگ سامنے لاتی ہیں

جوان کے فطری جذبات، ان کی تہذیب اور ان کے فنکارانہ شعور کو ملا جلا کر ایک نئی کیفیت پیدا کرتا ہے۔'' (۴۴)

ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنے مضمون ''نذر تابش'' میں تابش دہلوی کی شخصیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

تابش صاحب کو قریب سے دیکھنے کے بعد ایک دن مجھے خیال آیا کہ اگر صرف ایک لفظ میں ان کی شخصیت کا بیان مقصود ہو تو کونسا لفظ موزوں ہوگا؟ وہ لفظ بھی فوراً ذہن میں آگیا۔ نفیس، گڑھی ہوئی شخصیت، وضعدار انسان اور اس قسم کی دوسری ترکیبیں استعمال ہوتی رہتی ہیں مگر میری رائے میں تابش صاحب کی سیرت وکردار کا صحیح اظہار ''نفیس'' سے ہوتا ہے۔ زبان ہو، شاعری ہو، رہن سہن ہو، زندگی کا عام رویہ ہو، تابش صاحب ہر سطح پر نفیس ہی نظر آتے ہیں۔ بڑے باقاعدہ انسان ہیں۔ نظم وضبط کے عادی، گھر پر ان کی نشست سب سے الگ تھلگ ہے، صاف ستھری ہر چیز قرینے کی، ہر چیز اپنی جگہ، کتابیں ہوں، قلم کاغذ سب صاف ستھرے، مجال ہے کہ کوئی چیز بے جگہ ہو؟ سادگی پسند ہیں مگر سادگی میں بھی ایک آن ہے۔ (۴۵)

ڈاکٹر سحر انصاری نے تابش دہلوی کی غزل کے بارے میں اپنے ایک مضمون تابش دہلوی کی شاعری'' میں لکھا ہے:

تابش صاحب کی غزل ان کی شخصیت کا پرتو لیے ہوئے ہے۔ ان کی غزل میں وہی متانت، سنجیدگی اور نرمی ہے جو ان کی شخصیت اور زندگی کے عام آداب میں نظر آتی ہے۔ تابش دہلوی کی غزل غم ذات، غم کائنات، عشق، تفکر، اخلاقیات، تصوف یا فلسفہ میں سے کسی ایک موضوع کے گرد گھومنے والی نہیں۔ ان کی غزل میں خاصا تنوع ہے اور تنقید کی مروجہ آسانیوں کی رُو سے ان کی گزل کو کسی ایک خانے میں رکھ کر دیکھنا ممکن نہیں۔

تابش صاحب ایک حساس، سنجیدہ اور صاحب نظر شاعر کی حیثیت سے زندگی کے ہر پہلو پر غور کرتے اور جذبے اور فکر کی ہم آہنگی سے اپنے تجربات کو غزل کے رنگ میں پیش کرنے کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ ان کی غزل کسی فیشن کی پابند

نہیں۔نہ وہ اتنے قدیم اور روایتی ہیں کہ ان کی غزل کو عجائب خانے کے نوادر
میں شمار کیا جائے اور نہ اتنے جدید کہ تقویم کی طرح اسے بدلتے چلے
جائیں۔تابش صاحب نے قدیم و جدید اور رویت و تجربے کے مابین ایک
توازن قائم کیا ہے۔اس عمل میں ان کے مزاج کو بڑا دخل ہے جو ہر قسم کی افراط و
تفریط سے گریزاں ہے۔(۳۶)

تابش دہلوی کی غزل کے اسلوب، غزل اور فانی بدایونی سے اکتساب و اثرات کے بارے
میں ڈاکٹر سحر انصاری نے مزید لکھا ہے:

فانی کو جب میں غزل کے ایک صناع (Craftsman) کی حیثیت سے
دیکھتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اردو غزل کی دو انتہاؤں یعنی میرؔ اور غالبؔ کو تخلیقی
سطح پر انھوں نے یکجا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ عمل جزوی طور پر ہوا ہے ورنہ
اس امتزاج کے بعد تو فانی کو ان دونوں سے بڑا شاعر ہو جانا چاہیے تھا۔تابش
دہلوی کے یہاں اگر فانی سے متاثر ہونے کی کوئی مماثلت مجھے نظر آتی ہے تو یہی
کہ وہ اپنی غزل کے لب و لہجے میں میر اور غالب کو تخلیقی سطح پر یکجا کرنا چاہتے
ہیں۔۔۔۔تابش صاحب کی غزل کا خمیر ایک ایسے اسلوب سے اٹھا ہے جسے
ان کی شاعرانہ صلاحیت، لطافتِ احساس اور شعورِ زبان و بیان نے ایک مدت
میں تشکیل دیا ہے۔۔۔ان کے اسلوب میں وجدان کی بے ساختہ کارفرمائی کے
ساتھ ساتھ ایک شعوری صناعی بھی ملتی ہے۔(۳۷)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے تابش دہلوی کی غزل کی انفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے درج ذیل دو
باتیں تحریر کی ہیں:

تابش دہلوی اردو کے ان معدودے چند شاعروں میں سے ہیں جو شاعری
کو "حمزہ کا قصہ" یا "لڑکوں کا کھیل" نہیں سمجھتے بلکہ قدیم دہلوی شعرا کی طرح وہ
قطرہ میں دجلہ اور جزو میں کل دیکھنے دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔۔ایک اور
چیز تابش کی شاعری کو دوسرے غزل گو شعرا سے ممتاز کرتی ہے اور یہ ہے
دہلویت کا پاس۔تاریخ میں دہلویت نام ہے سلاطین و امراء کے تزک و احتشام

کا اور ہند ایرانی تہذیب وثقافت کی مرکزیت کا۔ لیکن شاعری میں دہلویت کہتے ہیں خیال کی پاکیزگی کو جذبے کی صداقت کو، بیان کی صفائی کو، اسلوب کی دلکشی کو، روحانی اقدار کے پاس کو، داخلیت کے انعکاس کو، لفظ و معنی کے باہمی ارتباط کو، دردمندی و انسان دوستی کو اور میر و مرزا سے لے کر سائل و بے خود تک کی روایتِ شعری کے احساس کو۔ یہ ساری چیزیں تابش کی شاعری میں شعوری یا غیر شعوری طور پر بڑی خوبصورتی سے در آئی ہیں اور اسی کی بدولت ان کی شاعری میں معنی خیزی و دلنشینی کی وہ سنجیدہ فضا پیدا ہوئی ہے جس سے ان کے بہت سے ساتھی محروم ہیں۔(۴۸)

احمد ندیم قاسمی، تابش دہلوی کی غزل کی توانائی اور کمال کا ذکر کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

حضرت تابش دہلوی نے ایک غزل گو کی حیثیت سے اُس زمانے میں نام پیدا کیا جب فانی، فراق، یگانہ، اصغر، جگر اور حسرت کے سے اساتذۂ فن کی غزلوں سے سارا برصغیر گونج رہا تھا۔ دنیائے شعر کی اتنی قد آور شخصیات کی موجودگی میں انھی کی محبوب صنفِ سخن میں ناموری حاصل کرنا مشکل کام تھا مگر تابش دہلوی کی غزل نے یہ کام کر دکھایا۔ اس کا سبب ان کی بعض انفرادی خصوصیات ہیں۔۔۔ تابش نے فانی سے غمِ زندگی کا گداز اور غالب سے اسرار کائنات پر فکر و تامل کا حوصلہ حاصل کیا اور اپنی غزل میں درد کی تہذیب اور غم کی شائستگی کے ساتھ ساتھ حیات اور ماورائے حیات کے مسائل سے، فن کی سطح پر نمٹنے کی خوبصورت اور موثر مثالیں پیش کیں۔ زبان کے تیور ان سب پر مستزاد تھے۔۔۔ ہمارے ہاں ایسی منجھی ہوئی غزل کہنے والے اب بہت کم رہ گئے ہیں۔(۴۹)

معروف شاعر احسان دانش نے تابش کی شاعری کے معیار اور کیفیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

میں نے بے شمار مشاعرے ان کے ساتھ پڑھے اور انھوں نے ہر مشاعرے میں ایسا کلام پڑھا جس سے سامعین اور شعراء کی معلومات میں اضافہ ہوا۔۔۔ جناب تابش متین اور سنجیدہ شاعری کرتے ہیں۔۔۔ وہ صرف خوب

صورت الفاظ کے تاروں پر نہیں جھولتے اور نہ ٹکسال کے انبار لگاتے ہیں بلکہ ان کے یہاں اُس مقام کی شاعری ہوتی ہے جسے خوش ذوق شرفاء سن کر حظ اٹھاتے اور کم ذوق لوگ سوچنے لگتے ہیں۔ میں نے تابش سے ہمیشہ معیاری اشعار سنے اور خلوت و جلوت میں انھیں شرافت کے معیار سے گرتا نہیں دیکھا۔ ایسے لوگ راہ داں نہیں راہ گر ہوتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں کے نقشِ قدم پر چل کر آنے والی نسلوں میں ادب کا ذوق منتقل ہوتا ہے۔ (۵۰)

احمد ہمدانی نے تابش دہلوی کی غزل کی حسیت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

تابش صاحب اپنی غزل میں جس حسیت کا اظہار کرتے ہیں وہ میر، مصحفی اور آتش سے مختلف ہے، انھوں سے ان تمام استادوں سے فیض اٹھایا ہے لیکن خود کو ان میں گم ہونے نہیں دیا۔ یہ وہ رویہ ہے جس نے انھیں روایت اور جدت کی پیوندکاری کا ہنر سکھایا اور ہمارے خیال میں فنی تخلیق روایت ادت جدت کی پیوندکاری اور امتزاج کے بغیر ممکن نہیں۔ (۵۱)

نسیم امروہوی کی تابش دہلوی کی زباندانی اور ان کی غزلوں میں موجود محاسن کے بارے میں رائے ملاحظہ کیجیے:

آپ کے کلام میں دلی کے ہر مکتبۂ فکر کی بڑی گہری چھاپ ہے جو غالب سے شروع ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو دلی کے اساتذہ سے مختص ہیں۔ بیان کی پختگی، بندش کی چستی، لفظوں کا صحیح استعمال، روزمرہ کی چاشنی، فکر کی گہرائی و گیرائی غرض وہ تمام محاسن آپ کے کلام میں موجود ہیں جو ایک ماہر فن استاد اور خوش بیاں شاعر کے ہاں ہونے چاہئیں۔ (۵۲)

ڈاکٹر محمد عزیر، تابش دہلوی کے نثری مجموعے 'دید باز دید' پر لکھے گئے اپنے مضمون میں انھیں ''شمس الشعراء'' یا ''آفتابِ سخن'' کا لقب دینے کی سفارش کرتے ہوئے لکھا ہے:

کلاسیکی رچاؤ اور ٹکسالی انداز میں جدید حوالوں اور فکری گہرائی کے ساتھ حضرت تابش دہلوی جیسا کوئی اور غزل گو شاعر نہیں ہے۔۔۔۔ تعجب ہے کہ

اب تک اہلِ ذوق نے حضرت تابش کو کوئی لقب نہیں دیا۔ میں ہر چند کہ ادب کے میدان میں سبزۂ بیگانہ ہوں ضروری سمجھتا ہوں کہ "شمس الشعراء" یا " آفتابِ سخن" کا لقب تابش صاحب کو پیش کیا جائے۔ تابش صاحب کی شاعری کی عمر بفضل تعالیٰ طویل ہے۔(۵۳)

ڈاکٹر محمود الرحمن نے تابش کی غزل سے شدتِ وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

غزل تابش دہلوی کی عزیز ترین شے ہے۔ وہ اس صنفِ سخن کی مخالفت برداشت نہیں کر سکتے۔ اس پر جب بھی آنچ آئے گی وہ سینہ سپر ہو کر اس کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔۔۔ ان کی شاعری پر خارجی عوامل پوری طرح اثر انداز ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے معاشرے اور اس کے بدلتے ہوئے ادوار کا بغور جائزہ لیا ہے اور ہر تاثر کو شعر میں سمونے کی کوشش کی ہے۔"(۵۴)

محمد عثمان رمز نے اپنے مضمون "عرفانِ ذات کا شاعر" میں تابش دہلوی کے کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالنے کے بعد آخر میں لکھا ہے:

تابش کے کلام میں شعور اور وجدان کی ہم آہنگی نمایاں ہے۔ وہ مضمون میں صرف ندرت ہی کے قائل نہیں بلکہ وہ نئی جہتوں کی تلاش پر پوری قدرت بھی رکھتے ہیں۔۔۔ تابش کی شاعری کا لہجہ دھیما ہے۔ لہجے کا یہ دھیما پن سخن شناس کے دل میں اتر جاتا ہے۔ لہجے کے دھیمے پن نے تابش کی شاعری میں ایک غنائی صنعت پیدا کر دی ہے۔ یہ ہے ان کے کلام میں گفتگو کا انداز اور گفتگو بھی سہلِ ممتنع میں۔(۵۵)

مولانا ماہر القادری نے ان کی شاعری اور شخصیت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

تابش شاعر بھی ہیں اور شاعر گر بھی ہیں۔ بہت سے نوجوان شاعروں نے ان سے استفادہ کیا ہے۔۔۔ تابش کی شاعری تعمق و تفکر کا مطالبہ کرتی ہے۔ خیال اور اظہارِ خیال میں ان کا اسلوب منفرد ہے۔۔۔ تابش کی شاعری میں چھیڑ

چھاڑ، لس و تقبیل اور سطحی اشارے کنایے نہیں ہیں۔ رمزیت اور اشاریت بے
شک ہے مگر وہ سنجیدہ ہے۔ یہی باقاعدہ سنجیدگی ان کے کلام کی امتیازی
خصوصیت ہے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے ایک دہلوی شاعر کے کلام میں
زبان کا رچاؤ پایا جانا ہی چاہیے۔(۵۶)

افضل صدیقی نے اپنے مضمون ''تابش دہلوی اپنے کلام کے آئینے میں'' میں تابش دہلوی کے فکر و فن کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

بلا شبہ تابش کی شاعری اسلوب اظہار کی جدت ہی کی بنا پر کھری غزل کی
شاعری ہے۔ اس طرز فکر کا سلسلہ غالب اور فانی سے ملتا ہے لیکن دردمندی اور
ذاتی کرب کا کائناتی کرب سے ہم آہنگی کا قرینہ میر تقی میر کے سلسلے سے آیا
ہے۔(۵۷)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے تابش دہلوی کی شخصیت کا تذکرہ اپنے ایک مضمون ''تابش میری نظر میں'' میں ان الفاظ میں کیا ہے:

پاکستان میں تابش دہلوی ان چند گنے چنے حضرات میں ہیں جن سے اُس
تہذیب اور شائستگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو برصغیر میں مسلمانوں کی تہذیبی
روایت کی حیثیت سے معراج کمال کو پہنچی، متانت، رکھ رکھاؤ، تہذیب و
شائستگی، نرم لہجہ جو اُن کی شخصیت کے پہلو ہیں وہ ان کے کلام میں نظر آتے
ہیں۔(۵۸)

ڈاکٹر انور سدید نے نے اپنے ایک مضمون ''آزادی کے بعد پاکستان میں اردو غزل کے عناصر اربعہ'' میں جو کہ ۱۹ نومبر ۱۹۹۷ء کے روزنامہ ''جسارت'' میں چھپا، تابش دہلوی کو پاکستانی اردو غزل کے عناصر اربعہ میں سے ایک قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

پاکستان میں اردو غزل کے عناصر اربعہ میں تابش دہلوی کا شمار اس لیے ضروری
ہے کہ انھوں نے اپنا بچپن اردو غزل کے قدیم دیاروں میں گزارا۔ عنفوانِ
شباب میں جدید غزل کے قرینے میں آ گئے۔ دہلی، حیدرآباد، دکن اور لکھنو میں
اس دور کے اساتذۂ غزل کی علمی اور ادبی صحبتوں سے فیض حاصل کیا۔۔۔

بلاشبہ انھوں نے روایت کی پاسداری کی اور زمانے کا ساتھ دیا لیکن اپنا تشخص
اپنی گزل سے قائم کیا اور اب یہ غزل ان کی انفرادیت کی مظہر اور ان کی پہچان
ہے۔۔۔میرا اندازہ ہے کہ اس وقت تابش دہلوی واحد شاعر ہین جن کی غزل
میں دو زمانوں کا ایسا امتزاج اور قدیم و جدید کا ایسا ادغام موجود ہے جو فطری
انداز میں عمل میں آیا ہے اور جس کی آبیاری لاشعور کے تخلیقی سرچشموں سے ہوئی
ہے۔"(۵۹)

ڈاکٹر وقار احمد رضوی اپنے مضمون" تابش دہلوی کی شاعری" میں تابش کی شاعری اور شخصیت
کے سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:

جناب تابش دہلوی ایک ثاقب النظر، سریع الخاطر اور مہذب الذوق شاعر
ہیں۔وہ قدروں کے ناقص اور تجربات کے مبصر ہیں۔ان کی شاعری میں
وجدانی تاثرات کے ساتھ ساتھ سائنسی صداقت، عقل و آگہی اور ادراک و شعور
ہے۔۔۔مسعود الحسن تابش دہلوی" خالص غزل" کے شاعر ہیں۔ان کی
غزل منفرد شاعرانہ صفاتگی حامل نظر آتی ہے۔۔۔ان کی شاعری میں کہیں
زبان و بیان، فصاحت و بلاغت، تشبیہات و استعارات، عروض اور صنائع و بدائع
میں کوئی جھول نہیں آتا۔یہ ان کی کامیاب شاعری کی دلیل ہے۔(۶۰)

پروفیسر سردار نقوی نے اپنے مضمون" تابش دہلوی کا تخلیقی شعور" میں تابش دہلوی کو پاکستان
میں غزل پر گفتگو کا معتبر حوالہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

تابش دہلوی پر گفتگو کا بنیادی حوالہ ان کی شاعری ہے لیکن یہ بھی ایک امر
حقیقت ہے کہ پاکستان میں اردو شاعری بالخصوص غزل پر گفتگو کا ایک معتبر
حوالہ خود تابش دہلوی ہیں۔۔۔اپنی شاعری کی طرح تابش صاحب کی
شخصیت بھی انھی کیفیات کی حامل ہے۔ان کی شخصیت کی وحدت یک رنگی کا
سپاٹ پن نہیں بلکہ نیرنگی کا توازن و اعتدال ان کی شخصیت کا حسن ہے اور یہی
ان کی زندگی کا توازن۔(۶۱)

خالد علیگ نے اپنے مضمون" تابش دہلوی ایک فرد ایک ادارہ" میں تابش دہلوی کو بلند فکر شاعر

اور بے حد سادہ تنقید نگار قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

ایک صاحبِ فکر و نظر اور بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ تابش صاحب ایک بے حد سادہ کار تنقید نگار بھی ہیں۔ شاید انھیں سکہ بند اور تسلیم شدہ نقادانِ ادب و فن کی صف میں تو شمار نہ کیا جا سکے مگر ان کے مضامین اور یادداشتوں کا مجموعہ ''دید باز دید'' تنقیدی خاکہ نگاری میں ان کے گہرے شعور کی عکاسی ضرور کرتا ہے۔ اس طرح گزشتہ ساٹھ سال کی ادبی و مجلسی زندگی کے بعض ایسے مخصوص افراد، حالات و واقعات اور گوشوں کی نقاب کشائی ہو جاتی ہے جن سے آئندہ کے لیے ادبی تنقید و تحقیق کی راہیں بھی کھل سکتی ہیں۔ (۶۲)

رئیس امروہوی نے تابش کے ادبی مقام منزلت کو بیان کرتے ہوئے انھیں ''کلاسیکی روایت کے نوادرِ عہد'' کے الفاظ سے یاد کیا ہے:

تابش دہلوی شعرائے کراچی کے طبقۂ متقدمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم سب سے سینئر ہیں۔ شرفائے دہلی کی وضعداری کا نمونہ، حلم و اخلاق کے پیکر اور غزل کی کلاسیکی روایت کے ایسے جید و مستند نمائندے کہ اس اعتبار سے ان کا شمار نوادرِ عہد میں کرنا چاہیے۔ (۶۳)

ہوش امروہوی نے اپنے تاثراتی مضمون ''تابش بھائی'' میں ان کی شخصیت و شاعری کے حوالے سے لکھا ہے:

تابش بھائی ہر لحاظ سے انتہائی بااصول اور نہایت نفاست پسند ہیں خواہ وہ لباس ہو، شاعری ہو یا دوستی۔ کھرے آدمی ہیں، بغض و کینہ سے قطعاً پاک، دوستوں کے دوست۔۔۔ وہ تقریباً ۷۰ سال سے اس (شاعری کے) میدان میں ہیں اور ہر اعتبار سے اس صنفِ سخن پر مکمل دسترس رکھتے ہیں۔ (۶۴)

ڈاکٹر شاہدہ حسن نے اپنے مضمون ''تابش دہلوی ایک تاثر'' میں تابش دہلوی کی شاعری اور ان کی شخصیت میں کسی قسم کے تضاد کی نفی کرتے ہوئے لکھا ہے:

ان کی شاعری اور شخصیت میں کوئی تضاد نہیں بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ اگر کسی نے ان سے بالمشافہ ملاقات نہ بھی کی ہو تو ان کے شعروں کے آئینے میں جو چہرہ منعکس

ہو رہا ہے اس کے سارے خط و خال ان کے اصل چہرے سے حیرت انگیز طور پر
مماثل نظر آئیں گے۔ ایک وضعدار، سنجیدہ خو، صاحب نظر شخصیت جس کے رکھ
رکھاؤ اور وضعداریوں میں ایک پوری تہذیب اپنی جھلک دکھاتی ہے اور جس کے
لہجے کا ٹھہراؤ اور جس کی بردبار گفتگو میں لفظوں کے چناؤ کے ساتھ ساتھ آواز کے
زیر و بم سے بھی شخصی اعتبار کا بھرپور تاثر قائم ہوتا ہے۔ (۶۵)

مسلم شمیم نے اپنے مضمون "اعتبار غزل" میں تابش دہلوی کو برصغیر کے بزرگ ترین شاعر اور
مسلم الثبوت استاد فن قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

ان کے شعری رکھ رکھاؤ میں دبستان لکھنو اور دبستان دہلی کی جھلک بھی ملتی ہے
اور حیدر آباد کے تہذیبی ماحول کا عکس بھی۔ کراچی کو تاریخ نے برصغیر کے تمام
خطوں اور مراکز کے ثقافتی اور تہذیبی دھاروں کا سنگم بنا دیا۔۔۔ وہ آج بلا شبہ
برصغیر کے ان بزرگ شعراء میں سے ہیں جن کو مسلم الثبوت استاد فن کا منصب
حاصل ہے اور اردو کا شعری سرمایہ جن کے جواہر پاروں سے وقیع تر گردانا
جاتا ہے۔ (۶۶)

ڈاکٹر شکیل رضا نوازش نے اپنے مضمون "تابش دہلوی فکر و فن" میں تابش دہلوی کی غزلیہ شاعری
کو نئے شاعروں کے لیے زریں صحیفے کے مترادف قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

تابش دہلوی کی غزلیہ شاعری جدید دور کے شاعروں کے لیے ایک زریں صحیفے
سے کم نہیں جس میں خلوص بھی ہے اور پیغمبرانہ شان بھی جو آج کے دور کے شاعر
کو پیغام دیتی ہے کہ کس طرح غزل کے پامال شدہ راستوں پر انفرادیت کے
قدم ثبت کیے جا سکتے ہیں۔" (۶۷)

عثمان رمز نے تابش دہلوی کی نعت کے بارے میں اپنے ایک مضمون "تابش دہلوی کی نعتیہ
شاعری" میں لکھا ہے:

ان کی انفرادیت کا راز ان کی غزل گوئی میں ہے یا نعت گوئی میں اس کا تعین بڑا
مشکل ہے۔ کمیت کے اعتبار سے ان کی نعتیں چاہے کم ہی کیوں نہ ہوں کیفیت
کے اعتبار سے ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ (۶۸)

ڈاکٹر شکیل رضا نوازش نے تابش دہلوی کی نظموں کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

> تابش دہلوی اگر نظم گوئی کی طرف اس کا فر غزل سے ہاتھ چھڑا کر توجہ دیں تو نظمیہ شاعری میں بھی گراں بہا اضافے کر سکتے ہیں۔(۶۹)

متذکرہ بالا تمام آرا اور اقتباسات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنے میں قطعی طور پر کوئی تامل نہیں کہ تابش دہلوی بلا شبہ پاکستان میں کلاسیکی اردو غزل کی روایت اور اسلوب بیان کے ثقہ علمبردار، شاعری کے دہلوی لب و لہجے کے امین اور ہند اسلامی ادبی تہذیب و شائستگی کا قابل فخر نمونہ تھے۔

ان کی غزلیں، نظمیں، نعتیں، منقبتیں اور حمد و ہائیکو بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ان کی شاعری زبان و بیان، روایت و جدت اور موضوع و ہیئت کے اعتبار سے نہ صرف لائق تقلید و تحسین ہیں بلکہ اہل فن و کمال کے لیے بھی رہبر و رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی باتیں تابش دہلوی کی شاعری کو طول عمر دینے کی بلا شبہ ضامن بھی ہیں۔

☆☆☆

خطِ تابش

(تابش دہلوی کا منظوم و منثور نمونہ تحریر)

تابش دہلوی بالکل صاف، واضح اور خطِ نستعلیق میں لکھتے تھے۔ لکھنے سے پہلے سوچتے اور غور کرتے تھے۔ عموماً لکھ کر کاٹنے اور بار بار کاٹ کر لکھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بات ابھی منزلِ یقین پر نہیں پہنچی اور ابھی لکھنے والے کو اپنی بات پر اعتماد حاصل نہیں ہوا یا بات کا اسلوب بیان ناقص رہا ہے جس میں بہتری کی بھرپور گنجائش ہے۔ تابش دہلوی کی تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پہلے خوب سوچتے، تولتے، جانچتے پھر آخر میں خیال کو صفحۂ قرطاس پر رقم کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں لکھ کر کاٹنا نہیں پڑتا تھا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اس حوالے سے لکھا ہے:

> لباس کی طرح تابش صاحب کی تحریر بھی بڑی اجلی ہے۔ نستعلیق لکھتے ہیں شکست کے قائل نہیں۔ بالعموم لکھ کر کاٹتے نہیں۔ (۷۰)

ذیل میں تابش دہلوی کی نظم اور نثر کا ایک ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے۔ ان کی ایک تازہ غزل ان کے ہی عکسِ تحریر میں ملاحظہ کیجیے جو ان کے مطبوعہ مجموعوں میں سے کسی میں شامل نہیں ہے۔ اس غزل کے مقطع میں اس بات کا ذکر بھی کیا گیا ہے کہ یہ غزل "تازہ" ہے۔

دلکش دلکش لفظ و معنی ، بحر نہایت خوش آہنگ
تابش تیری تازہ غزل کا ہر مصرع بر جستہ ہے

یہ غزل ان کی کلیات یعنی "کشتِ نوا" میں موجود ہے۔
ان کی یہ تازہ غزل انھی کے خط و املا میں اگلی صفحے پر ملاحظہ کیجیے:

ہوش امروہوی کے مجموعۂ کلام "بکھر گئی خوشبو" کے غالباً پیش لفظ کے لیے تابش دہلوی کا لکھی ہوئی تحریر کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

— (غزل) —

خرمنِ جاں یا خرمنِ ہستی کسی سے یہ وابستہ ہے
سوزِ دروں سے اپنا آپ آتش سا لگی شرارِ جستہ ہے

رنگ برنگی رنگ بکا تختۂ چمن سے یہ پیوستہ ہے
گلچیں چمن میں چننے آیا ہے خود بھی آتش گلدستہ ہے

ہم تو ذریعہ جانتے ہیں مقصد کو حصولِ مقصد کا
اہلِ طلب کے مسلک میں تو منزل بھی اک رستہ ہے

رزقِ غمِ اسیری بنایا ہے رسم جو اسیروں کو قیاد
کوئی نہیں پرواز آمادہ گرچہ دام شکستہ ہے

نالۂ تو ہے حلقۂ زنجیر آلودۂ آہ سے بھی
بکھرے گرد و ادب اپنی جستجو سب خستہ ہے

قیدِ غم سے جو بھی چھٹے ہیں کب کے وہ قیدی آزاد
ایک بھی نا شورِ سلاسل زنداں میں پابستہ ہے

حسرتِ منزل و منزل سے آسودہ ہوا تو کیونکر ہو
راہ نما بھی نا آمادہ پائے طلب بھی خستہ ہے

تیرا یہ اظہارِ نخوت کم نہیں عجزِ نخوت سے
دیکھو آ کر جھکنے والے سامنے سے قد بستہ ہے

دلکش دلکش لفظ و معنی بحر مناسب خوش آہنگ
آتش تیری تازہ غزل کا ہر مصرع برجستہ ہے

پ آتش دہلوی

انتخابِ کلام

حمد باری تعالیٰ

اے ربِ ذو الجلال والا کرام اے خدا
تُو ہی خبر ہے اپنی تُو ہی اپنا مدعا
عاری تعینات سے ہے اس قدر بسیط
محدود اس قدر کہ دلوں میں سما گیا
تیری صفات معطی و مغنی و مقتدر
تیری صفات منذر و قہار و کبریا
تُو عینِ ذات خلطِ مراتب سے بے نیاز
تیری صفات فرقِ مدارج سے ماورا
ہر نغمہ تیرے سوزِ محبت سے جاں نواز
ہر جام تیرے بادۂ عرفاں سے دلکشا
قطرہ ترے کرم سے بضاعت میں بحر ہے
قدرت سے تیری، ذرے میں صحرا سمٹ گیا
کہسار تیرے داب و جلالت کے پاسدار
دریا ہیں تیرے جود و سخاوتکا آئینہ
یکساں ترے سحابِ کرم کو ہیں بحر و بر
تجھ سے ہی فیضیاب ہیں کیا شاہ کیا گدا
توبہ کو تُو ہی دیتا ہے اقبال کا شرف
ہوتی ہے مستجاب ترے در پہ ہر دعا
تابشؔ یہ لطفِ خاص کہ اس کے جہان میں
کوئی نہیں ہے حامی و ناصر ترے سوا

☆☆☆

مدینہ سے واپسی پر (۱۸ مارچ ۱۹۸۴ء)

طیبہ سے عجب کیف و اثر لے کے چلا ہوں
اک دولتِ بیدار کو گھر لے کے چلا ہوں

نظروں میں چمک سوزِ جدائی کی چمک ہے
آنکھیں نہیں آنکھوں میں گہر لے کے چلا ہوں

پہلو میں مدینہ کی تڑپ ہے متواتر
تسکین بہ اندازِ دگر لے کے چلا ہوں

دل سجدہ گزاری سے ابھی تک نہیں فارغ
ہر چند سبکساریٔ سر لے کے چلا ہوں

پلکوں سے اٹھا لایا ہوں خاکِ درِ اقدس
آنکھیں نہیں میں کیسۂ زر لے کے چلا ہوں

تابندہ ہیں چہرے پہ مرے ریت کے ذرے
غازہ رخِ گردِ سفر لے کے چلا ہوں

طیبہ کے خوش آثار مناظر ہیں مرے ساتھ
آنکھوں میں نیا حسنِ نظر لے کے چلا ہوں

پائے ہیں ابھرتے ہوئے تازہ افقِ زیست
طیبہ سے نئے شام و سحر لے کے چلا ہوں

ہر لحظہ ہیں وا مشرق و مغرب کے دریچے
ہمراہ بہت شمس و قمر لے کے چلا ہوں

آوازِ اذاں صرف حرم میں نہیں گونجی

اس گونج کو تا قلب و نظر لے کے چلا ہوں

کیونکر نہ ہو پُر سوز و پُر انوار مری روح
اک برقِ تجلی کے شرر لے کے چلا ہوں

معمور ہے اب عشقِ نبیؐ سے مرا سینہ
چہکار جہاں میں یہ پیر لے کے چلا ہوں

پائی ہے نجات اپنے مفاسد سے بہر گام
ہر وہم کی دیوار میں در لے کے چلا ہوں

☆☆☆

غزل

(۱)

بارِ حیات اٹھائیے تنہا اٹھائیے
یہ بوجھ آپ سے نہیں اٹھتا ، اٹھائیے

وحشت میں خاک اڑانی ہی مقسوم ہے تو پھر
اک مشتِ خاک کیا؟ سرِ صحرا اٹھائیے

اِن خستگانِ راہ کو ہمراہ لے چلیں
قدموں کے ساتھ نقشِ کفِ پا اٹھائیے

خونبار کربِ دید کے منظر ہیں رُو بہ رُو
اب جس طرف بھی چشمِ تماشا اٹھائیے

بیمارِ عصر جلد شفا یاب ہو سکیں
گہوارے سے اک اور مسیحا اٹھائیے

دنیا سے زندگی کا بڑا حوصلہ ملا
احساں کی طرح ہر غمِ دنیا اٹھائیے

نادیدہ منظروں کو اگر چاہیں دیکھنا
اپنی ہی ذات سے کوئی پردہ اٹھائیے

دل میں نفاذِ شوق کی طاقت کہاں سے لائیں
کوزہ میں کیا تلاطمِ دریا اٹھائیے

پامردیوں سے گزرے ہیں جو راہِ شوق میں
پلکوں سے اُن کی گردِ کفِ پا اٹھائیے

تابشؔ سہارا لیجیے نہ امید و بیم کا
تنہا کبھی حجابِ تمنا اٹھائیے

☆☆☆

(۲)

مزاجِ زیست کا ایک ایک رخ دکھا کے چلے
ہم اپنی ذات سے سارے حجاب اٹھا کے چلے

ہمیں ہیں راستۂ شوق میں سبک رفتار
چلے زمانہ تو ہم سے قدم ملا کے چلے

نہ ہاتھ آیا کسی طرح وہ گلِ خوبی
بہت تلاش میں ہمراہ ہم صبا کے چلے

قدم قدم پہ تھا ناکام حسرتوں کا ہجوم
اسی ہجوم میں ہم راستہ بنا کے چلے

ملے گا تو بھی کہ اب تیرے ڈھونڈنے والے
تری تلاش میں اپنا سراغ پا کے چلے

نہ چھین لے کوئی اس کو بھی اس لیے ہمدم
متاعِ درد زمانے سے ہم چھپا کے چلے

وہ ناخدا جسے دعویٰ ہو ناخدائی کا
سفینہ سیلِ حوادث سے کیوں بچا کے چلے

جو اپنی راہ سلامت روی سے چلتے ہیں
زمانہ ان کے قدم سے قدم ملا کے چلے

نوید ہو ترے شیدائی جانبِ مقتل
کفن بدوش چلے، خون میں نہا کے چلے

خدا کا شکر کہ ناکامیوں سے تابش کی
ہزار کام کسی بندۂ خدا کے چلے

☆☆☆

(۳)

یہ مجھ سے کس طرح کی ضد دلِ برباد کرتا ہے
میں جس کو بھولنا چاہوں اُسی کو یاد کرتا ہے

قفس میں جس کے بازو شل ہوئے رزقِ اسیری سے
وہی صیدِ زبوں صیاد کو صیاد کرتا ہے

طریقے ظلم کے صیاد نے سارے بدل ڈالے
جو طائر اُڑ نہیں سکتا اُسے آزاد کرتا ہے

افق سے دیکھ کر رعنائیاں ہم خاک زادوں کی
زمیں بوسی کی کوشش چرخِ بے بنیاد کرتا ہے

تھپیڑے وقت کے کتنے سبق آموز ہوتے ہیں
زمانہ بھی تو کارِ سیلیِ استاد کرتا ہے

ستم اہلِ جہاں کا حوصلہ دیتا ہے جینے کا
وہ بارِ غم اٹھانے میں مری امداد کرتا ہے

کیا تھا خلد میں ابلیس نے گمراہ آدم کو
اب آدم زاد کو گمراہ آدم زاد کرتا ہے

دلِ افسردہ میں جب ضعف سے کچھ بھی نہیں باقی
نشاطِ شوق کا مژدہ کسے پھر شاد کرتا ہے

وہ جوئے شیر ہو یا جوئے خوں، دونوں برابر ہیں
کہ اِن دونوں کو جاری تیشۂ فرہاد کرتا ہے

دلِ ویراں میں تابشؔ کیوں تمنائیں بساتے ہو
بڑے ناداں ہو صحرا بھی کوئی آباد کرتا ہے

☆☆☆

ایک جن ایک آدمی

(جنگجو اقوام عالم کے نام)

سنا ہے یہ پریاں یہ جنات ہیں قاف کے رہنے والے!
وہی قاف۔۔۔
جس کی زمیں ہے زمرد کی، نیلم کے ہفت آسماں ہیں
جہاں کی فضاؤں میں ہیں لعل و مرجاں کے طائر پرافشاں
ہوئیں ترنم فروش اور نغمہ بر زباں ہیں
بہت دور تک سیم و زر کے پہاڑوں کا اک سلسلہ ہے
بیاباں ہیں کندن کے، پکھراج کی وادیاں ہیں
درختوں میں لگتے ہیں ہر روز زریں خوشے
مے وانگبیں کے بھی چشمے رواں ہیں
کھلا کرتے ہیں پھول دن رات، شاداب چہروں کی صورت
جہاں سرو شمشاد کی شکل میں نوجواں ہیں
جہاں شہر در شہر بستے ہیں زریں قبا و کمن پر
بہت خوش جمالوں کی آبادیاں ہیں جہاں
جہاں دشت در دشت نجم و مہ و مہر بکھرے پڑے ہیں
جہاں گوہر ہائے نایاب سیل رواں یم بہ یم ہیں
وہاں موت کوئی تصور نہیں شعبۂ زندگی کا
حیاتِ ابد راحتِ جاوداں لحظہ لحظہ مگر
اس طلسمِ طرب تک پہنچنا کچھ آساں نہیں ہے
بہت دشت و دریا درمیاں ہیں!!

یہ سارا علاقہ ہے زیرِ نگیں ایک سردار جن کا، اور اک اک قدم پر

ہزاروں طلسم و فسوں پاسباں ہیں!!!

مگر ایک طوطے میں اس جن کی جاں ہے مقید

یہ طوطا ہے موتی محل میں اور اس راستے میں

بہت موت کی گھاٹیاں ہیں بہت کوہ و دریا

مگر آدمی نے تدبر کے ہاتھوں اسے مار ڈالا

کہاں ہیں وہ پریاں وہ جن وہ طلسم و فسوں اب کہاں ہیں؟؟

جنوں سے یہ انسان کتنا بڑا ہے!!!

مگر اس زمیں پر جہاں زندگی ہے کہ بکھری پڑی ہے

ہزاروں طلسمات اک اک قدم پر عیاں ہیں نہاں ہیں

کہیں خُردسالی میں تقدیسِ عمرِ ابد ہے

کہیں سال خُوردہ زمان و مکاں آفرینش نشاں ہیں

کبھی ہر نظر غرب ماہ جبیں، شرقِ ماہِ منور

کہیں سال خُوردہ زمان و مکاں آفرینش نشاں ہیں

کبھی ہر نظر غرب ماہ جبیں، شرقِ ماہِ منور

کبھی چرخِ افکار و عرشِ تصور، یہی قلب و جاں ہیں

خرد کے لیے قطرہ قطرہ ہے نارفتہ طوفاں

جنوں کے لیے پھول ہے ناشگفتہ گلستاں

کبھی اک گلِ نغمہ فردوسِ راحت ہوا ہے

کبھی حرفِ شیریں میں سو لذتیں دو جہاں کی

کبھی دسترس میں ہیں لاکھوں طلسمی جزیرے

کہیں دور رنگیں خیالات کی بستیاں ہیں

کبھی اک تبسم میں ہیں زعفراں زارِ نیم شگفتہ

خرابات کی وادیاں اک ترنم سے پیدا

کہیں ایک منظر پہ ہے منحصر حسن جلوہ گری کا

کبھی اک تجلی جہان در جہاں ہے

غرض سارے آفاق کی وسعتیں گم ہیں اس آدمی میں

بہت بے کراں یہ دل و جاں کی پہنائیاں ہیں۔۔۔ بہت بیکراں

یہ ذہن تو نہیں ہے، اسے مار دینا کچھ آساں نہیں ہے

یہاں تک رسائی ہے مشکل، دو عالم یہاں درمیاں ہیں

جنوں سے یہ انساں کتنا بڑا ہے!! یہ کمزور انسان!

☆☆☆

جشنِ آزادی بنام کربلا

(یوم آزادی ۱۴ اگست ۱۹۸۹ء اور عاشورہ ایک ہی ساتھ)

کربلا کا جب بھی ہم لیتے ہیں نام
ہم کو آزادی کا ملتا ہے پیام
اس لیے منسوب باصد احترام
اپنی آزادی کے روشن صبح و شام
کربلا اور کربلا والوں کے نام

جسمِ آزادی میں دوڑا کر لہو
کربلا والے ہوئے ہیں سرخرو
کشتِ جاں کو دے گئے جوشِ نمو
اہلِ دل اہلِ محبت کا سلام
کربلا اور کربلا والوں کے نام

درسِ قربانی دیا ہے سربسر
موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
کر گئے ہیں زندگی کو معتبر
حرزِ جاں رکھتے ہیں جب ہی خاص و عام
کربلا اور کربلا والوں کے نام

حوصلہ پایا عزیمت مل گئی
ردِ باطل کی سعادت مل گئی

ہم کو آزادی کی نعمت مل گئی
لوحِ ہستی کے لیے نقشِ دوام
کربلا اور کربلا والوں کے نام

صبر سے توڑا ہے جابر کا غرور
خوش ضمیری سے کیا ردِ فتور
مرگ تاریکی ہوا باطن کا نور
کیوں نہ ہوں تابندہ و روشن مدام
کربلا اور کربلا والوں کے نام

ہم بھی راہِ صدق پر ہوں گامزن
حق کی خاطر ہم بھی ہوں باطل شکن
ہم بھی آزادی پہ واریں جان و تن
جشنِ آزادی کا سارا اہتمام
کربلا اور کربلا والوں کے نام!!

☆☆☆

کربلائے کشمیر

"اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے"

جو وادیٔ کشمیر تھی گہوارۂ اسلام
اُس وادیٔ کشمیر میں اک حشر بپا ہے

ہر گوشۂ کشمیر میں ہیں کشتوں کے پشتے
ہر سمت رواں دجلۂ خونِ شہدا ہے

پھر دوب گیا حلق میں آوازۂ تکبیر
پھر زخموں سے سینہ کسی گُل رُو کا زُندھا ہے

پھر بوڑھے اٹھاتے ہیں جواں بیٹوں کی لاشیں
پھر خیموں سے اٹھتی ہوئی ماتم کی صدا ہے

پھر بھائی کوئی ہے صفِ اعدا میں اکیلا
شانہ کسی سالار کا پھر تن سے جدا ہے

پھر گُم کسی مقتل میں ہوئی ہے کوئی بچی
پھر تیروں سے چھلنی کوئی معصوم گلا ہے

پھر دستِ ستم میں کسی بی بی کی ہے چادر
زنجیر بپا پھر کوئی بیمار ہوا ہے

جھلسے ہوئے انفاس ہیں شعلوں کی لپٹ سے
پھر برقِ شقاوت سے کوئی خیمہ جلا ہے

آتا نہیں کوئی کہ ضرورت ہے مدد کی
سنتا نہیں کوئی کہ گلوگیر صدا ہے

تاریخ نے دہرایا ہے پھر کرب و بلا کو

یہ معرکہ ایسا حق و باطل کا بپا ہے

پھر بھی نہیں مایوس یہ کشمیر کے غازی

حامی ہے نبیؐ، ان کا مددگار خدا ہے

لہرائے گا آزادیٔ کشمیر کا پرچم

گونجی ہوئی تکبیر کے نعروں سے فضا ہے

کھلنے کو بہت جلد ہیں زنداں کے دریچے

ہر حلقۂ زنجیر ستم ٹوٹ رہا ہے

مشرق میں ہیں آثار نئی صبح کے پیدا

پردے میں شبِ تار کے خورشید نیا ہے

☆☆☆

منقبت حضرت عثمان غنیؓ

ایثار کا پیکر ہیں وفا کیش و جری ہیں
منجملۂ احباب رسولِ عربی ہیں

وہ مکہ و طیبہ ہو کہ خندق کہ احد ہو
ہر وقت دل وجان سے ہمراہِ نبیؐ ہیں

تقویٰ کی طرح جن کی حیا، جوہر کردار
اخلاق میں جو مظہر عالی نسبی ہیں

اسلام کی عظمت پہ ہے قربان زر و مال
خود مال سے بے گانۂ راحت طلبی ہیں

جو ان کے کمالات کی دیتے ہیں گواہی
تاریخ میں تابندہ وہ سب نقش ابھی ہیں

اسلام کی نظروں میں ہیں امت کے سپاہی
دنیا کی نگاہوں میں وہ عثمانِ غنیؓ ہیں

جو وحدتِ اسلام پہ صدقے ہوئی تابش
قربان اسی ذات پہ اُمی و ابی ہیں

☆☆☆

منقبت حضرت علی

مدار زندگی حب نبیؐ ہے
تسلسل سانس کا نامِ علی ہے
علی کا نام لو پیہم کہ یہ نام
نصابِ جاں کا عنوانِ جلی ہے
علی بستر پہ سوتے ہیں نبیؐ کے
مگر قسمت علی کی جاگتی ہے
رسالت تو ہے بنیادِ امامت
سند دوشِ نبیؐ سے مل گئی ہے
الوہیت نہ کیوں شانِ علی ہو
علی ، ربُّ العلا کا نام بھی ہے
یدُ اللّٰہی لقب ، شمشیرِ حیدر
شجاعت دوسرا نامِ علی ہے
زمانے کے لیے ہارون و موسیٰ
علی اس طرح ہمدوشِ نبیؐ ہے
جہاں میں آج کا دن کفر کی موت
حرم میں آج میلادِ علی ہے
دوگانہ رتبہ ہے تابشؔ علی کا
ولی اللہ ہے احمد کا وصی ہے

☆☆☆

سلام

معرکہ اب بھی بپا شدت کا خیر و شر میں ہے
آج بھی انسان عہدِ کربلا منظر میں ہے

شانِ شبیریؑ سے ظاہر تھا نمازِ فجر میں
جو تہِ خنجر ادا ہو گا وہ سجدہ سر میں ہے

دولتِ دارین ہے وہ اے زمینِ کربلا
دفن جو گنجِ سعادت تیری خاکستر میں ہے

تیری تقسیمِ علم سے صاف ہوتا تھا عیاں
باغِ جنت بھی ترے دستِ کرم گستر میں ہے

مظہرِ شانِ سیادت خانوادہ ہے ترا
مسندِ حقِ امامت ہے کہ تیرے گھر میں ہے

دونوں اوجِ آدمیت پر ہیں یکساں سر بلند
دیکھنے میں فرق کتنا اصغرؑ و اکبرؑ میں ہے

صفدری کی شان سے معلوم ہوتا ہے یہی
جیسے شمشیرِ دو دم اب بھی کفِ حیدرؑ میں ہے

کیوں نہ ہو تاثیر ہو تابشؔ ترا اک ایک شعر
کربلا والوں کا ماتم شعر کے پیکر میں ہے

☆☆☆

ہم انھیں صاحبِ تسلیم و رضا کہتے ہیں
زیرِ خنجر بھی خدا کو جو خدا کہتے ہیں

خلدِ راحت ہے بہر گام وفا کی منزل
بھی اس راہ کے سب آبلہ پا کہتے ہیں

کیوں نہ ہو خاک ، شہیدانِ وفا کی اکسیر
یہ وہ مٹی ہے جسے خاکِ شفا کہتے ہیں

بُو ترابی پہ علی تو ہیں خدا کے بندے
ہائے وہ لوگ علی کو جو خدا کہتے ہیں

دعوئ فتح و ظفر جن کو ہے ان سے پوچھو
سر ہو مظلوم کا نیزے پہ تو کیا کہتے ہیں

دیتے ہیں سب کو دلاسا دمِ رخصت شبیرؑ
دیکھیے عابدؑ بیمار سے کیا کہتے ہیں

لے کے جا حضرت شبیرؑ میں تابشؔ کا سلام
بس یہی تجھ سے ہم اے بادِ صبا کہتے ہیں

☆☆☆

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کا مکتوب بنام تابش دہلوی۔

باسمہٖ سبحانہٗ و تعالیٰ

Professor
Dr. Ghulam Mustafa Khan
M.A, LL.B, Ph.D, D. Litt.

1, OLD UNIVERSITY CAMPUS,
HYDERABAD, SINDH.

DATED ۲۹ مارچ ۱۹۹۹ء

مکرم بھائی جان السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ نے دو کتابیں "دھوپ چھاؤں" اور "دید باز دید" عنایت فرمائیں۔ بہت ممنون ہوں۔

آپ کو "بھائی جان" لکھنے پر فخر محسوس کرتا ہوں، کیونکہ آپ مجھ سے چند ماہ بڑے ہیں۔ میں اپنے بزرگوں کی پرانی روایت پر بحمداللہ قائم ہوں۔

"خاکے" آپ ضرور لکھ دیں، کیونکہ اُن کو دیکھنے والے اب بہت کم رہ گئے ہیں۔ خود آپ کے ددھیالی اور ننھیالی کتنے بزرگ ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔

بہت کمزور ہو گیا ہوں۔ دعا میں یاد رکھیے۔

فقط والسلام

مخلص غلام مصطفیٰ

بعد میں آپ کا مجموعۂ سخن "ماہِ شکستہ" بھی مل گیا۔ بہت ممنون ہوں۔

جوش ملیح آبادی کا مکتوب بنام تابش دہلوی۔

تابندہ باش حضرت تابش

محبت نامہ ملا۔ جی خوش ہو گیا۔

بیمار ہوں زیادہ لکھا نہیں جاتا۔

آپ کا محبِ صادق

جوش

اسلام آباد

۸۱/۳/۲۳

مجروح سلطان پوری کا مکتوب بنام تابش دہلوی۔

Majrooh Sultanpuri

[illegible]

حوالہ جات

سوانح و شخصیت

۱۔ صہبا لکھنوی: "انکشاف ذات" بشمولہ "مجلہ نذر تابش" کل پاکستان حلقہ ادب کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۶۳

۲۔ مختار زمن: "تابش ایک تاثر" بشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۱۷۸

۳۔ صہبا لکھنوی: "انکشاف ذات" بشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۱۶۳

۴۔ ایضاً ص ۱۶۳

۵۔ مختار زمن: "تابش دہلوی ایک تاثر" بشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۱۷۸

۶۔ ایضاً ص ۱۷۵

۷۔ جاوید حسن، سید: "تابش صاحب" بشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۲۹۹

۸۔ محمود الرحمان، ڈاکٹر: "تابش دہلوی شخصیت اور شاعری" بشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۲۲۵

۹۔ افضل صدیقی: "تابش اپنے کلام کے آئینے میں" بشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۲۳۸

۱۰۔ مختار زمن: تابش دہلوی ایک تاثر" بشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۱۷۸

۱۱۔ ایضاً ص ۱۷۸

۱۲۔ تابش دہلوی: "ابتدا" بشمولہ "دید باز دید" کل پاکستان حلقہ ادب کراچی، طبع دوم، ۱۹۹۷ء، ص ۱۲

۱۳۔ ایضاً ص ۱۲

۱۴۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: "نذر تابش" بشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۱۷۱

۱۵۔ محمود الرحمان، ڈاکٹر: "تابش دہلوی شخصیت اور شاعری" بشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۲۲۵

۱۶۔ تابش دہلوی، بحوالہ: راز مراد آبادی: "سید مسعود الحسن تابش دہلوی" بشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۱۸۶

۱۷۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: "نذر تابش" بشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۱۷۲

۱۸۔ تابش دہلوی: "جب میں حیدر آباد میں تھا" بشمولہ "دید باز دید" کل پاکستان حلقہ ادب کراچی، طبع دوم، ۱۹۹۷ء، ص ۹۱

۱۹۔ انور سدید، ڈاکٹر: "آزادی کے بعد پاکستان میں اردو غزل کے عناصر اربعہ" بشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۳۳۹

۲۰۔ مختار زمن: "تابش دہلوی ایک تاثر" بشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۱۸۰

۲۱۔ صہبا لکھنوی، مدیر افکار کراچی: "انکشاف ذات" بشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۱۶۳

۲۲۔ افضل صدیقی: "تابش اپنے کلام کے آئینے میں" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۲۳۹

۲۳۔ محمود الرحمان، ڈاکٹر: "تابش دہلوی شخصیت اور شاعری" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۲۲۵

۲۴۔ افضل صدیقی: "تابش اپنے کلام کے آئینے میں" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۲۳۷

۲۵۔ تابش دہلوی: "جب میں حیدرآباد میں تھا" مشمولہ "دید باز دید" کل پاکستان حلقہ ادب، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۷۵

۲۶۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: "نذرِ تابش" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۱۷۵

۲۷۔ وقار احمد رضوی، ڈاکٹر: "تابش دہلوی کی شاعری" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۲۵۵

۲۸۔ شاہدہ حسن، ڈاکٹر: "تابش دہلوی: ایک تاثر" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۲۹۵

۲۹۔ افضل صدیقی: "تابش اپنے کلام کے آئینے میں" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۲۳۸

۳۰۔ غلام شبیر رانا: "عربی اسلوب" مشمولہ "سہ ماہی الاقرباء" الاقرباء فاؤنڈیشن اسلام آباد، جلد ۱۰ شمارہ نمبر ۱، جنوری تا مارچ ۲۰۰۷ء، ص ۵۲

۳۱۔ شاہدہ حسن: "تابش دہلوی: ایک تاثر" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۲۹۲

۳۲۔ افضل صدیقی: "تابش اپنے کلام کے آئینے میں" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۲۳۷

۳۳۔ تابش دہلوی، حرفِ آغاز: "چراغِ صحرا" کل پاکستان حلقہ ادب، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۹

۳۴۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: "نذرِ تابش" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۱۷۳

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۷۳

۳۶۔ اویس صدیقی: "جائزہ" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۱۹۳

۳۷۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: "نذرِ تابش" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۱۷۳

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۷۵

۳۹۔ تابش دہلوی، بحوالہ: اویس صدیقی: "جائزہ" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۱۹۳

۴۰۔ خالد علیگ: "تابش دہلوی ایک فرد یا ادارہ" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۲۷۸

۴۱۔ اویس صدیقی: "جائزہ" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۱۹۷

۴۲۔ ابوالخیر کشفی، سید: "تلاشِ جلوہ و حرفِ سپاس" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۲۰۱

۴۳۔ مشفق خواجہ: "مکتوب بنام نعیم صدیقی" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۲۳۷

۴۴۔ ایضاً، ص ۲۳۷

۴۵۔ ایضاً، ص ۲۳۷

۴۶۔ فرمان فتح پوری: "اقتباس" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۲۰۸

۴۷۔ عبداللہ خاور: "تیمرو ز میری نظر میں" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۱۸۲

۴۸۔ منتخب الحق، مولانا: "اقتباس" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۲۸۰

۴۹۔ واصل عثمانی: "حضرت تابش دہلوی اور ان کا طرزِ اصلاح" مشمولہ مجلّہ نذرِ تابش ص ۲۸۲

۵۰۔ ایضاً، ص ۴۸۲

۵۱۔ ایضاً، ص ۴۸۴

۵۲۔ ایضاً، ص ۴۸۲

۵۳۔ ایضاً، ص ۴۸۲

۵۴۔ ایضاً، ص ۴۸۲

۵۵۔ ایضاً، ص ۴۸۲

۵۶۔ ایضاً، ص ۴۸۲

۵۷۔ اقبال کاظمی، سید: "تابش دہلوی فروغ علم و ادب اور تہذیب و شائستگی کے لیے ایک تابندہ ادارہ"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۳۲۳

۵۸۔ ایضاً، ص ۳۲۲

۵۹۔ صبا لکھنوی، "انکشافِ ذات"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۱۹۳

۶۰۔ نیاز بدایونی، "میری پسندیدہ شخصیت: تابش دہلوی"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۳۱۷

۶۱۔ افضل صدیقی، "تابش اپنے کلام کے آئینے میں"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۴۳۰

۶۲۔ نیاز بدایونی، "میری پسندیدہ شخصیت: تابش دہلوی"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۳۱۸

۶۳۔ ایضاً، ص ۳۱۸

۶۴۔ محمود الرحمان، ڈاکٹر، "تابش دہلوی شخصیت اور شاعری"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۴۲۵

۶۵۔ ایضاً، ص ۴۲۳

۶۶۔ افضل صدیقی، "تابش دہلوی اپنے کلام کے آئینے میں"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۴۳۰

۶۷۔ راز مراد آبادی، "سید مسعود الحسن تابش دہلوی"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۱۸۶/۱۸۵

۶۸۔ محمود الرحمن، ڈاکٹر، "تابش دہلوی شخصیت اور شاعری"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۴۲۳

۶۹۔ صبا لکھنوی، "انکشافِ ذات"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۹

۷۰۔ محمود الرحمن، ڈاکٹر، "تابش دہلوی شخصیت اور شاعری"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۴۲۵

۷۱۔ راز مراد آبادی، "سید مسعود الحسن تابش دہلوی"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۱۸۶/۱۸۵

۷۲۔ ایضاً، ص ۱۸۶/۱۸۵

۷۳۔ ایضاً، ص ۱۸۷

۷۴۔ سرور جاوید، "تابش دہلوی ایک تہذیبی علامت"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۴۶۲

۷۵۔ تابش دہلوی، "مشاعروں کی کہانی"، مشمولہ "دید باز دید"، طبع دوم، کل پاکستان حلقہ ادب کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۵۸

۷۶۔ ایضاً، ص ۱۵۸

۷۷۔ ایضاً، ص ۱۵۸

۷۸۔ مختار زمن: "تابش دہلوی ایک تاثر" مشمولہ "مجلہ نذر تابش"، ص ۱۸۰

۷۹۔ افضل صدیقی: "تابش دہلوی اپنے کلام کے آئینے میں" مشمولہ "مجلہ نذر تابش"، ص ۳۳۰

۸۰۔ محمود الرحمن، ڈاکٹر: "تابش دہلوی شخصیت اور شاعری" مشمولہ "مجلہ نذر تابش"، ص ۲۲۳

۸۱۔ ادریس صدیقی: "جائزہ" مشمولہ "مجلہ نذر تابش"، ص ۱۹۶

۸۲۔ سرور جاوید: "تابش ایک تہذیبی علامت" مشمولہ "مجلہ نذر تابش"، ص ۲۶۲

۸۳۔ واصل عثمانی: "تابش دہلوی اور ان کا طرز اصلاح" مشمولہ "مجلہ نذر تابش"، ص ۲۸۲

۸۴۔ ادریس صدیقی: "جائزہ" مشمولہ "مجلہ نذر تابش"، ص ۱۹۸

۸۵۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: "نذر تابش" مشمولہ "مجلہ نذر تابش"، ص ۱۷۲

۸۶۔ ایضاً، ص ۱۷۳

۸۷۔ ایضاً، ص ۱۷۵

۸۸۔ محمود الرحمان، ڈاکٹر: "تابش دہلوی شخصیت اور شاعری" مشمولہ "مجلہ نذر تابش"، ص ۲۲۵

۸۹۔ ایضاً، ص ۲۲۵

۹۰۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: "نذر تابش" مشمولہ "مجلہ نذر تابش"، ص ۱۷۲

۹۱۔ ایضاً، ص ۱۷۳

۹۲۔ محمود الرحمان، ڈاکٹر: "تابش دہلوی شخصیت اور شاعری" مشمولہ "مجلہ نذر تابش"، ص ۲۲۳

۹۳۔ ایضاً، ص ۲۲۵

۹۴۔ ادریس صدیقی: "جائزہ" مشمولہ "مجلہ نذر تابش"، ص ۱۹۳

۹۵۔ مختار زمن: "تابش دہلوی ایک تاثر" مشمولہ "مجلہ نذر تابش"، ص ۱۸۱

۹۶۔ ادریس صدیقی: "جائزہ" مشمولہ "مجلہ نذر تابش"، ص ۱۹۳

۹۷۔ تابش دہلوی: "حرف آغاز" مشمولہ "نیم روز" طبع دوم، فرشیا پرنٹنگ پریس، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۱۹

۹۸۔ ایضاً، ص ۱۷

۹۹۔ تابش دہلوی: "حرف آغاز" مشمولہ "چراغ صحرا" طبع اول ۱۹۸۲ء، مطابع: نوید پرنٹنگ پریس ناظم آباد کراچی، ص ۱۳

۱۰۰۔ ایضاً، ص ۱۳

۱۰۱۔ ایضاً، ص ۱۱

۱۰۲۔ تابش دہلوی: "نئی شاعری" مشمولہ "دید باز دید" بک پاکستان حلقہ ادب کراچی، طبع دوم ۱۹۹۷ء، ص ۱۸۳

۱۰۳۔ تابش دہلوی: "حرف آغاز" مشمولہ "غبار انجم" طبع اول ۱۹۸۳ء، مطابع: نوید پرنٹنگ پریس ناظم آباد کراچی، ص ۱۳

۱۰۴۔ تابش دہلوی: "حرف آغاز" مشمولہ "چراغ صحرا" طبع اول ۱۹۸۲ء، مطابع: نوید پرنٹنگ پریس ناظم آباد کراچی، ص ۱۲

۱۰۵۔ تابش دہلوی: "فانی کی شاعری اور انبساط" مشمولہ "دید باز دید" بک پاکستان حلقہ ادب کراچی، طبع دوم ۱۹۹۷ء، ص ۱۰۳

۱۰۶۔ تابش دہلوی: "مشاعروں کی کہانی" مشمولہ "دید باز دید" بکل پاکستان حلقہ ادب کراچی طبع دوم، ۱۶۲

۱۰۷۔ تابش دہلوی: "جوان شاعری" مشمولہ "دید باز دید" بکل پاکستان حلقہ ادب کراچی طبع دوم، ۱۷۷

۱۰۸۔ تابش دہلوی: "نئی شاعری" مشمولہ "دید باز دید" بکل پاکستان حلقہ ادب کراچی طبع دوم، ۱۸۲

۱۰۹۔ تابش دہلوی: "محمد ذاکر علی خاں کا رختِ سفر" مشمولہ "دید باز دید" بکل پاکستان حلقہ ادب کراچی طبع دوم، ۱۳۱/۱۳۳

اساتذہ فن کی صحبت اور حلقۂ احباب و معاصرین

۱۔ تابش دہلوی: "حضرت جگر مرادآبادی: کچھ یادیں" مشمولہ "دید باز دید" بکل پاکستان حلقہ ادب، کراچی طبع دوم ۱۹۹۷ء، ص ۳۳

۲۔ ایضاً، ص ۳۶

۳۔ تابش دہلوی: "جوش حیدرآباد دکن میں" مشمولہ "دید باز دید"، ص ۴۰

۴۔ ایضاً، ص ۴۲

۵۔ تابش دہلوی: "میرزا یاس یگانہ" مشمولہ دید باز دید"، ص ۴۵

۶۔ تابش دہلوی: "ماہرالقادری" مشمولہ دید باز دید"، ص ۶۲

۷۔ ایضاً، ص ۶۳

۸۔ تابش دہلوی: "میراجی میرا دوست" مشمولہ دید باز دید"، ص ۵۷

۹۔ ایضاً، ص ۵۸

۱۰۔ تابش دہلوی: "برا آرزی" مشمولہ دید باز دید"، ص ۶۶

۱۱۔ تابش دہلوی: "جب میں حیدرآباد میں تھا" مشمولہ دید باز دید"، ص ۹۵

۱۲۔ تابش دہلوی: "کچھ یادیں کچھ باتیں" مشمولہ دید باز دید"، ص ۸۵

۱۳۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: "نذر تابش" مشمولہ "مجلہ نذر تابش" بکل پاکستان حلقہ ادب کراچی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۶۵

۱۴۔ شکیل رضا نوازش، ڈاکٹر: "تابش دہلوی فکر و فن" مشمولہ "مجلہ نذر تابش"، ناشر بکل پاکستان حلقہ ادب، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۲۱۰

۱۵۔ سرور جاوید: "ایک تہذیبی علامت" مشمولہ "مجلہ نذر تابش"، ص ۲۶۱

۱۶۔ تابش دہلوی: "کچھ یادیں کچھ باتیں" مشمولہ "دید باز دید" پبلشر بکل پاکستان حلقہ ادب گلشن آباد، کراچی، طبع دوم ۱۹۹۷ء، ص ۹۵

۱۷۔ مختار زمن: "تابش دہلوی ایک تاثر" مشمولہ "مجلہ نذر تابش"، ص ۱۷۹

۱۸۔ تابش دہلوی: "کچھ یادیں کچھ باتیں" مشمولہ دید باز دید"، ص ۸۹

۱۹۔ مختار زمن: "تابش دہلوی ایک تاثر" مشمولہ "مجلہ نذر تابش"، ص ۱۷۹

۲۰۔ ادریس صدیقی: "جائزہ" مشمولہ دید باز دید"، ص ۱۹۵

۲۱۔ تابش دہلوی: "فانی اور ان کا عمومی احساس" مشمولہ "دید باز دید"، ص ۱۰۹

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۱۴

۲۳۔ ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر، "تابش کی غزل"، مشمولہ "دید باز دید"، ص۱۶۹

۲۴۔ سحر انصاری، "تابش دہلوی کی شاعری"، مشمولہ دید باز دید"، ص۱۹۰

۲۵۔ سرور جاوید، "تابش-ایک تہذیبی علامت"، مشمولہ "مجلّہ نذر تابش"، ص۲۶۹

۲۶۔ ایضاً، ص۲۶۹

۲۷۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر، "نذر تابش"، مشمولہ "مجلّہ نذر تابش"، ص۱۷۲

۲۸۔ مختار زمن، "تابش دہلوی ایک تاثر"، مشمولہ "مجلّہ نذر تابش"، ص۱۸۰

۲۹۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر، "نذر تابش"، مشمولہ "مجلّہ نذر تابش"، ص۱۷۲

۳۰۔ شکیل نوازش رضا، ڈاکٹر، "تابش دہلوی: فکر و فن"، مشمولہ "مجلّہ نذر تابش"، ص۳۱۰

۳۱۔ تابش دہلوی، "کچھ یادیں کچھ باتیں"، مشمولہ دید باز دید"، ص۸۹

۳۲۔ تابش دہلوی، "احتساب"، مشمولہ "دھوپ چھاؤں"، کل پاکستان حلقۂ ادب، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص۵

۳۳۔ ادریس صدیقی، "جائزہ"، مشمولہ "دید باز دید"، ص۱۹۳

۳۴۔ ادریس صدیقی، "جائزہ"، مشمولہ "دید باز دید"، ص۱۹۳

۳۵۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر، "نذر تابش"، مشمولہ "مجلّہ نذر تابش"، ص۱۷۵

۳۶۔ تابش دہلوی، "محشر بدایونی-ایک جائزہ"، مشمولہ "دید باز دید"، ص۷۶

۳۷۔ تابش دہلوی، "میراجی میرا دوست"، مشمولہ "دید باز دید"، ص۵۸

۳۸۔ ایضاً، ص۵۵

۳۹۔ ایضاً، ص۵۶

۴۰۔ تابش دہلوی، "جب میں حیدرآباد میں تھا"، مشمولہ "دید باز دید"، ص۹۹

۴۱۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر، "نذر تابش"، مشمولہ "مجلّہ نذر تابش"، ص۱۷۵

۴۲۔ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر، "تابش دہلوی شخصیت اور شاعری"، مشمولہ "مجلّہ نذر تابش"، ص۲۲۳

۴۳۔ ادریس صدیقی، "جائزہ"، مشمولہ "دید باز دید"، ص۱۹۶

۴۴۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر، "نذر تابش"، مشمولہ "مجلّہ نذر تابش"، ص۱۷۵

تابش دہلوی کی غزلیں

۱۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، "نیم روز کا شاعر"، مشمولہ "مجلّہ نذر تابش"، ناشر: کل پاکستان حلقۂ ادب، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص۱۶۶

۲۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر، "نذر تابش"، مشمولہ "مجلّہ نذر تابش"، ص۱۷۳

۳۔ تابش دہلوی، "احتساب"، مشمولہ "نیم روز"، مطابع: افریشیا پرنٹنگ پریس ناظم آباد نمبر۲، کراچی، اشاعت دوم ۱۹۸۸ء، ص۵

۴۔ عبداللہ خاور، "نیم روز میری نظر میں"، مشمولہ "مجلّہ نذر تابش"، ص۱۸۱

۵۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، "نیم روز کا شاعر"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۱۹۵

۶۔ تابش دہلوی، "حرفِ آغاز"، مشمولہ "نیم روز"، افریشیا پرنٹنگ پریس، ناظم آباد نمبر ۲ کراچی، اشاعت دوم ۱۹۸۸ء، ص ۱۶

۷۔ ایضاً، ص ۱۷

۸۔ سرور جاوید، "تابش دہلوی: ایک تہذیبی علامت"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۲۶۳

۹۔ تابش دہلوی، "انتساب"، مشمولہ "چراغِ صحرا"، ناشر: ادب گاہ، ناظم آباد کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۵

۱۰۔ مجتبیٰ حسین، پروفیسر، "فلیپ"، مشمولہ "چراغِ صحرا"، مطابع: نوید پرنٹنگ پریس، ناظم آباد کراچی، ۱۹۸۲ء

۱۱۔ تابش دہلوی، "حرفِ آغاز"، مشمولہ "چراغِ صحرا"، ناشر: ادب گاہ، ناظم آباد کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۳

۱۲۔ سحر انصاری، پروفیسر، "تابش دہلوی کی شاعری"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۱۸۹

۱۳۔ سحر انصاری، پروفیسر، "تابش دہلوی کی شاعری"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۱۹۱

۱۴۔ تابش دہلوی، "حرفِ آغاز"، مشمولہ "ماہ شکستہ"، مطابع: سندھ آفسٹ پرنٹرز کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۱

۱۵۔ تابش دہلوی، "حرفِ آغاز"، مشمولہ "ماہ شکستہ"، مطابع: سندھ آفسٹ پرنٹرز کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۲

۱۶۔ تابش دہلوی، "انتساب"، مشمولہ "دھوپ چھاؤں"، مطابع: سندھ آفسٹ پرنٹرز کراچی، ص ۵

۱۸۔ شکیل رضا نوازش، ڈاکٹر، "تابش دہلوی فکر و فن"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ناشر: کل پاکستان حلقۂ ادب کراچی، س ن، ص ۳۱۰

۱۹۔ قاسمی، احمد ندیم، "فلیپ"، مشمولہ "چراغِ صحرا"، مطابع: نوید پرنٹنگ پریس، ناظم آباد کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۳۳۶

۲۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، "آزادی کے بعد پاکستان میں اردو غزل کے عناصرِ اربعہ"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۲۴۹

۲۱۔ تابش دہلوی، "حرفِ آغاز"، مشمولہ "چراغِ صحرا"، مطابع: نوید پرنٹنگ پریس، ناظم آباد کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۵

۲۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، "آزادی کے بعد پاکستان میں اردو غزل کے عناصرِ اربعہ"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۲۵۱

۲۳۔ شکیل نوازش رضا، ڈاکٹر، "تابش دہلوی فکر و فن"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۳۱۳

۲۴۔ ایضاً، ص ۳۱۰

۲۵۔ ایضاً، ص ۳۱۳

۲۶۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، "اقتباس"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۴۰۸

۲۷۔ ایضاً، ص ۴۰۸

۲۸۔ شکیل نوازش رضا، ڈاکٹر، "تابش دہلوی فکر و فن"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۳۱۳

۲۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، "آزادی کے بعد پاکستان میں اردو غزل کے عناصرِ اربعہ"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۲۵۰

۳۰۔ محمد عثمان رمز، "عرفانِ ذات کا شاعر"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۲۳۱

۳۱۔ رمز، محمد عثمان، "عرفانِ ذات کا شاعر"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۲۳۰

۳۲۔ ماہر القادری، مولانا، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۲۳۳

۳۳۔ محمد عثمان رمز، "عرفانِ ذات کا شاعر"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۲۳۱

۳۴۔ تابش دہلوی، "جوان شاعر"، مشمولہ "دید باز دید"، کل پاکستان حلقۂ ادب، کراچی، طبع دوم ۱۹۹۷ء، ص ۱۷۷

۳۵۔ وقار احمد رضوی، ڈاکٹر، "تابش دہلوی کی شاعری"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۲۵۵

۳۶۔ عبداللہ خاور، "نیم روز میری نظر میں"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۱۸۲

۳۷۔ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر، "تابش دہلوی، شخصیت اور شاعری"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۲۲۶

۳۸۔ تابش دہلوی، "حرفِ آغاز"، مشمولہ "نیم روز"، افریشیا پرنٹنگ پریس، کراچی، طبع دوم ۱۹۸۸ء، ص ۱۷

۳۹۔ محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، "نیم روز کا شاعر"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۱۹۶

۴۰۔ شکیل فرازش رضا، ڈاکٹر، "تابش دہلوی فکر و فن"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۳۱۲

تابش دہلوی کی نظمیں / تابش دہلوی کی مذہبی شاعری

۱۔ تابش دہلوی، "حرفِ آغاز"، مشمولہ "غبارِ انجم"، نوید پرنٹنگ پریس، ناظم آباد کراچی، طبع اول ۱۹۸۳ء، ص ۱۱

۲۔ ایضاً، ص ۱۱

۳۔ ایضاً، ص ۱۲

۴۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، "تابش دہلوی میری نظر میں"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، کل پاکستان حلقۂ ادب، کراچی، س ن، ص ۴۳۶

۵۔ ایضاً، ص ۴۳۶

۶۔ ایضاً، ص ۴۳۶

۷۔ افضل صدیقی، "تابش دہلوی اپنے کلام کے آئینے میں"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۲۳۱

۸۔ تابش دہلوی، "حرفِ آغاز"، مشمولہ "غبارِ انجم"، نوید پرنٹنگ پریس، ناظم آباد، کراچی، طبع اول ۱۹۸۳ء، ص ۱۳

۱۰۔ تابش دہلوی، "کچھ شاعری"، مشمولہ "دید باز دید"، کل پاکستان حلقۂ ادب، کراچی، طبع دوم ۱۹۹۷ء، ص ۱۸۲

۱۱۔ تابش دہلوی، "محمود اکرم علی خاں کا رختِ سفر"، مشمولہ "دید باز دید"، کل پاکستان حلقۂ ادب، کراچی، طبع دوم ۱۹۹۷ء، ص ۱۳۰

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۳۰ تا ۱۳۱

۱۳۔ محمد عثمان رمز، "تابش دہلوی کی نعتیہ شاعری"، مشمولہ "دھوپ چھاؤں"، سندھ آفسٹ پرنٹرز، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۳۳

۱۴۔ محمد عثمان رمز، "تابش دہلوی کی نعتیہ شاعری"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۱۵

۱۵۔ سید ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر، "تلاشِ جلوۂ حرفِ سپاس"، مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش"، ص ۲۰۰

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۰۰

۱۷۔ تابش دہلوی، "کچھ شاعری"، مشمولہ مجلّہ نذرِ تابش، ص ۹۳

۱۸۔ محمد عثمان رمز، "تابش دہلوی کی نعتیہ شاعری"، مشمولہ دھوپ چھاؤں، سندھ آفسٹ پرنٹرز، کراچی، طبع اول ۱۹۹۶ء، ص ۳۰

۱۹۔ تابش دہلوی، "محمود اکرم علی خان کا رختِ سفر"، مشمولہ "دید باز دید"، کل پاکستان حلقۂ ادب، کراچی، طبع دوم ۱۹۹۷ء، ص ۱۳۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۳۱

۲۱۔ سید ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر: "تلاشِ جلوہ و حرفِ سپاس" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۱۹۹

۲۲۔ تابش دہلوی: "نئی شاعری" مشمولہ: مجلّہ نذرِ تابش، ص ۹۳

۲۳۔ تابش دہلوی: "مرثیہ نگاری میں اثر جلیل کا مقام" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۸۹، ۹۰

۲۴۔ ایضاً، ص ۸۹

۲۵۔ شکیل رضا نوازش، ڈاکٹر: "تابش دہلوی فکر و فن" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۳۱۶

۲۶۔ جاوید حسن، سید: "تابش دہلوی" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۳۰۳

۲۷۔ تابش دہلوی: "نئی شاعری" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۹۷

۲۸۔ جاوید حسن، سید: "تابش دہلوی" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۳۰۱

۲۹۔ ایضاً، ص ۳۰۱

تابش دہلوی کی مرقع نثر / تابش دہلوی مشاہیر ادب کی نظر میں

۱۔ تابش دہلوی: "مبتدا" مشمولہ "دید باز دید" کل پاکستان حلقہ ادب، کراچی، طبع دوم، ۱۹۹۷ء، ص ۱۳

۲۔ ایضاً، ص ۱۲

۳۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: "نذرِ تابش" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۱۷۶

۴۔ شکیل رضا نوازش، ڈاکٹر: "تابش دہلوی، فکر و فن" مشمولہ "مجلّہ نذرِ تابش" ص ۳۱۶

۵۔ تابش دہلوی: "مبتدا" مشمولہ "دید باز دید" کل پاکستان حلقہ ادب، کراچی، طبع دوم، ۱۹۹۷ء، ص ۱۲

۶۔ تابش دہلوی: "کچھ یادیں کچھ باتیں" مشمولہ "دید باز دید" کل پاکستان حلقہ ادب، کراچی، طبع دوم، ۱۹۹۷ء، ص ۸۵

۷۔ تابش دہلوی: "یادِ ایامِ صحبت فانی" مشمولہ "دید باز دید" ص ۲۱

۸۔ ایضاً، ص ۲۱

۹۔ تابش دہلوی: "کچھ یادیں کچھ باتیں" مشمولہ "دید باز دید" ص ۸۸

۱۰۔ تابش دہلوی: "یادِ ایامِ صحبت فانی" مشمولہ "دید باز دید" ص ۲۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۱

۱۳۔ تابش دہلوی: "کچھ یادیں کچھ باتیں" مشمولہ "دید باز دید" ص ۸۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۸۸

۱۵۔ ایضاً، ص ۸۸

۱۶۔ ایضاً، ص ۸۸

۱۷۔ تابش دہلوی: "مشاعروں کی کہانی" مشمولہ "دید باز دید" ص ۱۵۶

۱۸۔ تابش دہلوی: "کچھ یادیں کچھ باتیں"، مشمولہ "دید باز دید"، ص ۸۱

۱۹۔ ایضاً، ص ۸۲

۲۰۔ تابش دہلوی: "جوش حیدرآباد دکن میں"، مشمولہ "دید باز دید"، ص ۳۹

۲۱۔ تابش دہلوی: "ماہر القادری"، مشمولہ "دید باز دید"، ص ۶۳

۲۲۔ تابش دہلوی: "میراجی میرے دوست"، مشمولہ "دید باز دید"، ص ۵۵

۲۳۔ ایضاً، ص ۵۶

۲۴۔ ایضاً، ص ۵۸

۲۵۔ ایضاً، ص ۸۸

۲۶۔ تابش دہلوی: "میراجی میرا دوست"، مشمولہ "دید باز دید"، ص ۵۹

۲۷۔ تابش دہلوی: "جب میں حیدرآباد میں تھا"، مشمولہ "دید باز دید"، ص ۹۴

۲۸۔ ایضاً، ص ۹۵

۲۹۔ تابش دہلوی: "ننھے بھائی"، مشمولہ "دید باز دید"، ص ۵۲

۳۰۔ ایضاً، ص ۵۳

۳۱۔ تابش دہلوی: "ماہر القادری"، مشمولہ "دید باز دید"، ص ۶۰، ۶۱

۳۲۔ ایضاً، ص ۶۳

۳۳۔ ایضاً، ص ۶۳

۳۴۔ تابش دہلوی: "حضرت جگر مرادآبادی: کچھ یادیں"، مشمولہ "دید باز دید"، ص ۳۳

۳۵۔ تابش دہلوی: "ماہر القادری"، مشمولہ "دید باز دید"، ص ۶۲

۳۶۔ تابش دہلوی: "فانی کی شاعری میں انفعالیت"، مشمولہ "دید باز دید"، ص ۱۰۳

۳۷۔ تابش دہلوی: "فانی کا عمومی طرزِ احساس"، مشمولہ "دید باز دید"، ص ۱۱۳

۳۸۔ خالد علیگ: "تابش دہلوی ایک فرد ایک ادارہ"، مشمولہ "مجلہ نذرِ تابش"، ص ۲۷۹

۳۹۔ تابش دہلوی: "جوش حیدرآباد دکن میں"، مشمولہ "دید باز دید"، ص ۴۲

۴۰۔ محمد حسن، ڈاکٹر: "نیم روز کا شاعر"، مشمولہ "مجلہ نذرِ تابش"، کل پاکستان حلقۂ ادب، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۶۵

۴۱۔ آفتاب احمد خاں: "تہنیتی پیغام"، مشمولہ "مجلہ نذرِ تابش"، ص ۴۱

۴۲۔ مکتوب امجد اسلام امجد بنام تابش دہلوی، س ن، مشمولہ "مجلہ نذرِ تابش"، ص ۲۵

۴۳۔ محمد حسن، ڈاکٹر: "نیم روز کا شاعر"، مشمولہ "مجلہ نذرِ تابش"، کل پاکستان حلقۂ ادب، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۶۶

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۶۶

۴۵۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: "نذرِ تابش"، مشمولہ "مجلہ نذرِ تابش"، کل پاکستان حلقۂ ادب، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۶۳

۴۶۔ محمد حسن، ڈاکٹر: "نیم روز کا شاعر" مشمولہ "مجلہ نذر تابش" کل پاکستان حلقہ ادب، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۹۵

۴۷۔ ایضاً، ص ۹۰

۴۸۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: "فلیپ" مشمولہ "چراغ صحرا" طبع اول، ۱۹۹۸ء، مطابع: نوید پرنٹنگ پریس، کراچی،
ناشر: ادب گاہ، ناظم آباد، کراچی

۴۹۔ قاضی احمد ندیم: "فلیپ" مشمولہ "چراغ صحرا" مطابع: نوید پرنٹنگ پریس، کراچی، ناشر: ادب گاہ، ناظم آباد، کراچی، طبع اول، ۱۹۹۸ء

۵۰۔ احسان دانش: "فلیپ" مشمولہ "چراغ صحرا" مطابع: نوید پرنٹنگ پریس، کراچی، ناشر: ادب گاہ، ناظم آباد، کراچی، طبع اول ۱۹۸۲ء

۵۱۔ احمد ہمدانی: "فلیپ" مشمولہ "چراغ صحرا" مطابع: نوید پرنٹنگ پریس، کراچی، ناشر: ادب گاہ، ناظم آباد، کراچی، طبع اول ۱۹۸۲ء

۵۲۔ نسیم امروہوی: "فلیپ" مشمولہ "دھوپ چھاؤں" طبع اول، ۱۹۹۶ء، مطابع: سندھ آفسٹ پرنٹرز، کراچی، پبلشر: کل
پاکستان حلقہ ادب، کراچی

۵۳۔ محمد عزیر، ڈاکٹر: "حضرت تابش دہلوی کی دیباچہ میں شخصیت نگاری" مشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۲۰۹

۵۴۔ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر: "تابش دہلوی شخصیت اور شاعری" مشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۲۲۶

۵۵۔ محمد عثمان رمز: "عرفان ذات کا شاعر" مشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۲۳۲

۵۶۔ ماہر القادری، مولانا: "اقتباس" مشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۲۳۳

۵۷۔ افضل صدیقی: "تابش دہلوی اپنے کلام کے آئینے میں" مشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۲۳۸

۵۸۔ ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر: "تابش میری نظر میں" مشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۲۴۳

۵۹۔ انور سدید، ڈاکٹر: "آزادی کے بعد پاکستان میں اردو غزل کے عناصر اربعہ" مشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۲۴۹/۲۵۰

۶۰۔ وقار احمد رضوی، ڈاکٹر: "تابش دہلوی کی شاعری" مشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۲۵۶/۲۵۳

۶۱۔ سردار نقوی، پروفیسر: "تابش دہلوی کا تخلیقی شعور" مشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۲۶۳

۶۲۔ خالد علیگ: "تابش دہلوی ایک فرد ایک ادارہ" مشمولہ: مجلہ نذر تابش" ص ۲۷۹

۶۳۔ رئیس امروہوی: "تابش" مشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۲۸۷

۶۴۔ جوش امروہوی: "تابش بھائی" مشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۲۵۹

۶۵۔ شاہدہ حسن، ڈاکٹر: "تابش دہلوی ایک تاثر" مشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۲۹۳

۶۶۔ مسلم شمیم: "اعتبار غزل" مشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۳۰۸/۳۰۷

۶۷۔ شکیل رضا نوازش، ڈاکٹر: "تابش دہلوی فکر و فن" مشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۳۱۵

۶۸۔ عثمان رمز: "تابش دہلوی کی نعتیہ شاعری" مشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۳۰۳

۶۹۔ شکیل رضا نوازش، ڈاکٹر: "تابش دہلوی فکر و فن" مشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۳۱۵

۷۰۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: "نذر تابش" مشمولہ "مجلہ نذر تابش" ص ۱۷۲

ڈاکٹر جابر حسین کا تعلق بلتستان کی خوب صورت وادی شگر سے ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی قصبے سے حاصل کی، بعد ازاں قراقرم انٹرنیشنل یونیورسٹی سے گریجویشن اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد سے اردو میں ایم۔اے کرنے کے بعد اسی جامعہ سے ''پاکستانی اردو غزل کی تنقید کا ارتقا'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

آپ پچھلے ایک عشرے سے اسلام آباد ماڈل کالج برائے طلبا ایف ٹین فور میں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ تحقیق و تنقید کے علاوہ تخلیق شعر میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ علمی، ادبی اور تہذیبی موضوعات پر ان کے درجن بھر سے زائد تحقیقی و تنقیدی مضامین و مقالات پاکستان، ہندوستان کے موقر ادبی تحقیقی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ مقامی اخبارات، سوشل میڈیا کے ادبی بلاگز اور مقامی رسائل میں بھی وقتاً فوقتاً ان کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔

9 789694 724553